انتخاب مہدی افادی

مرتبۂ

فیروز احمد

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات: ۱۲۲

انتخاب

مہدی افادی

مرتبہ

ڈاکٹر فیروز احمد

اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

© اتر پردیش اردو اکادمی

انتخابِ مہدی افادی

مرتب: ڈاکٹر فیروز احمد

پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء
تعداد ۱۱۰۰
قیمت چار روپے

ستیش چندر سریواستو اسکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے نشاط پریس ٹانڈہ ضلع فیض آباد سے چھپوا کر پلیرہ ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

اردو میں صاحب طرز نثر نگاروں کی تعداد زیادہ نہیں ایسے نثر نگاروں کی تعداد تو اور بھی کم ہے جن کی تخلیقات کی چمک دمک امتداد وقت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ مہدی افادی کا تعلق نثر نگاروں کے اسی ممتاز گروہ سے ہے۔ ان کے مضامین و مکاتیب کو غیر معمولی شہرت ملی اور آج بھی اردو کی اعلا تعلیم کی مختلف سطحوں پر ان کا مطالعہ ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی کے ترقیاتی منصوبوں میں یہ امر بھی شامل ہے کہ ممتاز ادیبوں کی تخلیقات کا جامع انتخاب شائع کیا جائے۔ انتخاب مہدی افادی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس سے نصابی ضرورتیں بھی پوری ہوں گی اور جو عمومی مطالعے کے لیے بھی کار آمد ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر فیروز احمد، استاد، شعبۂ اردو، راجستھان یونی ورسٹی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے مہدی افادی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اکادمی ان کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ اس کی فرمائش پر انہوں نے مہدی افادی کے مضامین کا انتخاب مرتب کیا اور اس پر وقیع مقدمہ لکھا۔

یقین ہے کہ اکادمی کی دوسری مطبوعات کی طرح اسے بھی حسن قبول ملے گا۔

اتر پردیش اردو اکادمی
قیصر باغ، لکھنؤ
۲۹ اپریل ۱۹۸۳ء

محمود الٰہی
چیرمین
مجلس انتظامیہ

ترتیب

مقدمہ ـــــــــــــ مرتب ۷

تمدن عرب پر ایک کھلی چٹھی ۱۶

علامہ نذیر احمد اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۲۳

دائرۂ ادبیہ ۳۳

فلسفۂ حسن و عشق ۴۱

ملک میں تاریخ کا معلم اوّل ۴۹

اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ ۵۷

اردو لٹریچر کا نفس واپسیں ۶۷

شبلی سوسائٹی ۸۱

حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک ۹۹

مقدمہ

شیخ مہدی حسن، جن کو ادبی دنیا میں مہدی افادی کے نام سے شہرت ملی، ۱۸۶۸ء میں بمقام گورکھپور شیوخ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ریاض الاخبار کی روایت کے مطابق ان کے والد حاجی علی حسن (م ۱۸۹۲ء) ایک مذہبی شخص اور سچے مسلمان تھے، وہ کورٹ انسپکٹر پولیس تھے اور ان کا شمار بہت ہر دل عزیز، نیک مزاج، مدبر، روسائے شہر میں ہوتا تھا

مہدی کی ابتدائی تعلیم دستور زمانہ کے مطابق ہوئی مگر عمر کی ایک خاص منزل میں پہونچ کر انہوں نے اردو فارسی اور انگریزی میں خاصی لیاقت پیدا کر لی۔ وہ جو کچھ بن سکے اس میں کسی رسمی نصاب یا اعلیٰ سند کا ہاتھ نہیں۔ اپنی خداداد ذہانت کے سبب عملی زندگی میں ایک محرر کی حیثیت سے قدم رکھتے ہوئے وہ تحصیلدار کے عہدہ تک پہنچے، ان کے زمانہ میں یہ تحصیلداری بقول شخصے ایک قسم کی شاہی ہوا کرتی تھی، مگر مہدی کے نزدیک یہ شاہی دراصل ان کی مجبوری تھی، وہ جس مزاج اور مذاق کے آدمی تھے اس کا تقاضا تھا کہ وہ مستقلاً زبان اور ادب کے ہو کر رہتے، مگر ان کی منصبی ذمہ داریاں بھی ان کے ساتھ تھیں اسی لیے شدید خواہش کے باوجود وہ اپنے منتشر خیالات کو بھی یکجا نہ کر سکے۔ ان کے انتقال (۱۹۲۱ء) کے بعد ان کی تیسری بیوی عزیز النسا (بیگم مہدی) نے ان کے مضامین اور مکاتیب مہدی (۱۹۳۸ء) کے نام سے شائع کر دیا۔ مکاتیب

کی اشاعت کے وقت مہدی بیگم نے "خاص اپنے نام" لکھے گئے مہدی کے خطوط کی اشاعت کا بھی ذکر کیا تھا مگر ان خطوط کی اشاعت کا قرعۂ فال ڈاکٹر محمود الٰہی کے نام نکلا اور اس طرح یہ خطوط بھی "صحیفۂ محبت" کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہو گئے۔

مہدی افادی علی گڑھ تحریک کے ابتدائی زمانہ میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال اس وقت ہوا جب اس تحریک کے ادبی مقاصد کے خلاف ایک نیا ادبی میلان ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ اس طرح ان کی فکر و نظر کا دھارا دو سمت میں بہتا ہے۔ ایک کا تعلق اپنے عہد کی اس ہمہ گیر تحریک سے ہے جس نے وقت اور زمانہ کی تغیر پذیری کا احساس دلایا، اور زندگی و ادب کو روح عصر کا ترجمان بنانے کی کوشش کی، اس دھارے کا نمایاں وصف یہ تھا کہ اس کے تحت جو ادب وجود میں آیا اس نے دل کے بجائے دماغ کو متاثر کیا۔ بظاہر یہ وقت کی ایک اہم ضرورت تھی مگر اس سلسلہ میں جس نکتہ کو نظر انداز کیا گیا وہ یہ تھا کہ دل کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور اگر کوئی ادبی تصور دل کے تقاضوں سے عمداً چشم پوشی کرتا ہے تو وہ تادیر جمہور کے نزدیک قابل التفات نہیں رہتا۔ سرسید اور ان کی تحریک نے دل کے تقاضوں یعنی نفس انسانی اور اسکے خواب و خیال کو قومی عزت اور قومی تفاخر کی بازیافت پر جس طرح قربان کیا اور اس کے وکٹورین اسپرٹ بخشنے کی جو سعی کی اس کا ردعمل ناگزیر تھا۔ یہ ردعمل اس عہد تغیر میں بعض متضاد عناصر کا مرہون منت ہے اس کی اہمیت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اس نے موضوع اور اسلوب دونوں سطحوں پر نمایاں نقوش چھوڑے ہیں۔ تیرہویں صدی، ادھ پنچ، دلگداز، مخزن اور صلائے عام کی بے پناہ مقبولیت اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ ان کے لکھنے والے زاہد خشک نہیں تھے۔ ان کا مقصد ادب کے سر پر نہ اخلاق کی نیابت کا تاج رکھنا تھا اور نہ یہ ادب کو سماج کی بہتری کا کوئی مؤثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے ان کی تحریروں میں عقلیت، واقعیت اور مقصدیت کے بجائے نفس انسانی کے ان

بنیادی تقاضوں کی اہمیت اور اس کا شاعرانہ بیان ملتا ہے جس پر سرسید تحریک نے سخت قدغن لگا رکھا تھا۔

مہدی کا ادب ان دونوں ادبی تصورات کا ترجمان ہے۔ ان کے یہاں 'دل' بھی ہے اور 'دماغ' بھی۔ دل کے تقاضوں نے انھیں میر ناصر علی دہلوی کی طرف مائل کیا اور دماغ نے عناصر خمسہ کے نتائج افکار سے ان کا ذہنی رشتہ استوار کیا۔ انہوں نے میر ناصر علی کو ایک بار لکھا تھا کہ "میں آپ کے لٹریچر کا اس وقت سے دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا" مہدی کا یہ قول بھی شہرت حاصل کر چکا ہے کہ "موجودہ نسل تمام تر تہذیب الاخلاق کے ادبی دور کی پیدا کردہ ہے"۔ اور یہ بھی کہ "اسی تہذیب الاخلاق نے مجھے کام کا آدمی بنایا"۔ بظاہر یہ متضاد بیانات ہیں مگر ایک کا تعلق مہدی کی جذباتی زندگی سے ہے جس میں جذبہ، احساس، لطافت خیال اور انداز نگارش کو اہمیت حاصل ہے اور دوسرے کا فکر و عمل کی اس تحریک سے جس نے اقلیت اور مادیت کا علم بلند کیا۔ مہدی بنیادی طور پر تعقل پسند اور مادیت کے پرستار تھے لیکن خود اپنے قول کی روشنی میں ایک "جذباتی فلسفی تھے" ان کے یہاں مقتضائے نفس اور شایان حال دونوں ایک ہیں یعنی جو دل میں ہے وہی زبان پر۔ ان کی زندگی اور شخصیت ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی وہ اپنے جذبہ اور احساس کا اظہار بہر حال چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے چند تاویلیں بھی تراشیں اور کہا کہ "میں ڈنکے کی چوٹ پر خیام کا ہم خیال ہوں جو شوخی سے ادھار پر نقد کو ترجیح دیتا ہے"۔ مہدی کے یہ خیالات اور دائرہ ادبیہ خواب طفلی اور آرزوے شباب، فلسفہ، حسن و عشق، اور بنت عم جیسے مضامین ایک ہی جذبہ کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس کا تعلق ان کی شخصی زندگی کے بعض حسیں لمحات سے بھی ہے۔ ان مضامین کا تعلق صنف نازک اور اس کے حسن سے ہے مگر صنف

نازک کی ترجمان کوئی اور نہیں بلکہ مہدی بیگم ہیں[1]۔ مہدی اور میرناصر علی دونوں عورت کی فطرت اور اس کی نفسیات کے ترجمان ہی نہیں بلکہ اس کے اداشناس اور نباض بھی تھے۔ اس کا اندازہ ان فقروں اور جملوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو دونوں کے ادبیات میں بکثرت موجود ہیں۔ مگر یہ عورت مہدی کی کمزوری نہیں۔ مہدی کے یہاں مجسم عشوہ گری تو ہے مگر زنجیر پا نہیں۔ یہ ان کی عقلی اور اخلاقی قوتوں کو حرکت میں لاتی ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے کہ وہ اس "نشہ" کا اثر لٹریچر میں بھی دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں۔

یہ مطالعۂ مہدی کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اس سے زیادہ تابناک اور معنی خیز ہے اور اس کا سراغ ان تحریروں میں ملتا ہے جو عناصر خمسہ اور ان کے ادبیات سے متعلق ہیں۔ یہاں مہدی کی جذباتی شخصیت پر ان کی تعقل پسندی غالب ہے۔ بنت عم کے بعد معاصرانہ چشمک تک مہدی نے جس قدر مضامین لکھے وہ اس حقیقت کے غماز ہیں کہ اب انھیں وہ منزل مل گئی جس کی تلاش ان کے ابتدائی مضامین میں نظر آتی ہے۔ اب وہ عقلیت کی اس شاہراہ پر گامزن تھے جو سرسید کی تحریک میں تھی اور جس نے خیال و عمل کے بے شمار گوشوں کو متاثر کیا تھا۔ اسی موڑ پر پہنچ کر مہدی نے ایک دوست کو لکھا تھا کہ "دل چیر کر دیکھو علی گڑھ کی جاروب کشی کرنے کو تیار ہوں" علی گڈھ اور سرسید تحریک سے اسی ذہنی وابستگی نے مہدی کی فکر و نظر میں وسعت پیدا کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ "ادب

---

[1] ایک مثال ملاحظہ کیجئے: "کچھ خبر بھی ہے، فلسفۂ حسن و عشق کی فتنہ گری جس نے کی تھی وہ سایہ کی طرح ساتھ ہے اور فتوحات کا سلسلہ ہے کہ قائم ہے۔ آپ کو پوچھنی ہے کہ کون بزرگ ہیں" مکاتیب مہدی ص ۱۲۴

صرف سادہ کاغذ پر سیاہی پھیلانے کا نام نہیں، اور اگر ہم تقاضائے وقت سے بے خبر ہو کر اسی عمل میں مصروف رہے تو نہ صرف زبان و ادب بلکہ ایک قوم کا بھی غیر تلافی نقصان ہوگا۔ اور انھیں کے بقول "یہ کھلا ہوا راز ہے کہ ملک میں جہاں تک مختلف اصناف ادب کا تعلق ہے لٹریچر کا ذخیرہ بڑھ رہا ہے لیکن کیا یہ انتشار عمل کے قاعدۂ کلیہ کے تحت میں ہے یا ہم اس سے حقیقی فوائد کے متوقع ہو سکتے ہیں۔ مہدی نے یہ سوال مختلف پیرایہ میں کیا ہے لیکن صرف یہ سوال ہی نہیں بلکہ ایک مشورہ بھی ہے اور مہدی کو مشورہ دینے اور نئے نئے منصوبے مرتب کرنے کا خبط تھا۔ وہ اردو زبان اور ادب کو ہمہ گیر بنانا چاہتے تھے، ان کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اردو ادب مغربی ادب کی سطح پر آجائے، وہ خود اس باب میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکے مگر ترجمہ کی غائت و ضرورت، وضع اصطلاحات اور زبان و ادب کو مختلف موضوعات سے مالا مال کرنے کی خواہش انھیں بے چین رکھتی تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے معاصرین کو خطوط بھی لکھے اور انہیں اپنے نقطۂ نظر کا پابند بنانے کی کوشش کی۔

کہا جاتا ہے کہ مہدی کے مضامین جمالیات کے گرد میں خیالات کی حسین پرواز ہیں۔ یہ بات کسی حد تک ان مضامین کے متعلق تو صحیح ہو سکتی ہے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ مگر مطالعہ مہدی میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان کی فکر میں متضاد عناصر کارفرما تھے۔ وہ بنیادی طور پر افادی اور تعمیری ادب کے قائل تھے، اور اس قسم کے ادب کا تصور انہیں سرسید تحریک سے ملا تھا۔ انہوں نے اس تحریک کی غرض و غائت اور اس سے وابستہ مصنفین کے نتائج افکار پر جس انداز میں تنقید کی ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خلا میں باتیں نہیں کرتے، وہ جو کہتے ہیں اس کی ٹھوس بنیاد ہوتی ہے۔ ان کے یہاں مصلحت پسندی نہیں، قطعیت رائے ہے۔ وہ بات میں بات پیدا

کرنے کے فن کے ماہر ہیں۔ یہ ان کی تنقید کا عیب بھی ہے اور حسن بھی۔ بیسویں صدی کے شروع میں حالی و شبلی کی تنقیدی روایت کو مستحکم کرنے، تنقید کو تحقیق کا پابند بنانے اور مغرب کے تنقیدی اصول و نظریات کے سہارے ادب کی افہام و تفہیم کا راستہ ہموار کرنے میں مہدی افادی کا بھی خون جگر شامل ہے۔ مگر مہدی کا المیہ یہ ہے کہ ان کی تحریریں اس دور میں سامنے آئیں جب تنقید کا قافلہ ایک خاص موڑ پر رک چکا تھا۔۔۔۔ پھر یہ کہ ان کا اپنا تخلیقی اور تنقیدی مزاج تھا۔ اسی مزاج نے ان کو شبلی پرست بنایا اور انہوں نے شبلی پر بار بار قلم اٹھایا یہاں تک کہ تکرار خیال کی نوبت آپہنچی۔ مگر ایسا نہیں کہ وہ شبلی کی ہر رائے سے متفق ہوں۔ انہوں نے شبلی سے اختلاف کیا اور بجا طور پر کیا۔ معاصرانہ چشمک پڑھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کے ان اعتراضات میں بڑا وزن ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اسکی علمی اور اصولی حیثیت ہے۔ اس کے باوصف مہدی کے نقد و نظر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مختلف الخیال ادبا کے نتائج افکار کا مقابلہ و موازنہ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ ہر ایک کی انفرادی حیثیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ فن کے بڑے پارکھ ہیں اور انھیں کے بقول "آج کل کی عوائد رسمیہ (ایٹی کیٹ) کی نزاکتیں شائستہ سوسائٹی میں موازنہ اوصاف کو جائز نہیں رکھتیں۔ لیکن مصنفین کے دماغوں کی رگڑ، فن تنقید کا ایک سخن گسترانہ فرض ہے جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی" مہدی اپنی تحریروں میں اس "سخن گسترانہ فرض" سے جہاں سبکدوش ہوئے ہیں وہ مقام اپنی معنویت کی آپ مثال تو ہے ہی، اس سے مہدی کی دقت نظر اور عصری ادب کے تناظر میں ان کی بالغ نظری کا بھی ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ مثالوں کی ضرورت نہیں لیکن اس نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ یہ مضامین اپنی تنقیدی اور ادبی حیثیت سے قطع نظر بعض اجتماعی مسائل کے بھی ترجمان ہیں۔

مہدی نے ان مسائل پر جس تحکمانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی، ادب اور سماج کو کس سطح پر لے جانا چاہتے تھے۔ مہدی روایتی ادب کے اس تصور سے بیزار تھے جو ذہنی تلذذ اور انبساط کا سامان تو فراہم کرتا ہے مگر ذہنی بیداری اور بصیرت کا نہیں۔ انہوں نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ آنکھیں ہر شخص رکھتا ہے لیکن بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ہو، یہ لازمی نہیں۔ دراصل مہدی ادب کے ذریعہ ایسی ہی بصیرت کے خواہاں تھے۔ جو معاشرتی سطح پر فرد کو مہذب اور متمدن بنانے میں معاون ہو سکے۔ یہی وہ مقام ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود الٰہی نے بڑی صائب رائے دی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"...اس وقت کے اخبارات و رسائل میں ان موضوعات سے ملتے جلتے مسائل پر برابر دوسروں کے مضامین نکلتے تھے، مگر جو بے لاگ تنقید مہدی افادی نے کی ہے، وہ صرف انھیں کا حصہ ہو کے رہ گیا ہے۔ ان مضامین سے جو بصیرت حاصل ہوتی ہے وہ خود اپنی جگہ پر عہد آفرینی کی ضامن ہے۔ علی گڈھ تحریک کے بنیادی اصولوں کی تشریح و تفسیر اتنے منطقی انداز میں اور کسی نے نہیں کی۔ وہ صرف ان کے شارح مفسر یا نقاد نہیں تھے بلکہ ان کے لیے نئے نئے قواعد و ضوابط وضع کرتے تھے اور اس کو ہمہ گیری اور وسعت دینے کی تدبیریں بتاتے تھے۔"[1]

مہدی کے مکاتیب بھی ادب کی جان ہیں۔ ان کے عہد تک اردو خطوط نگاری کی جو روایت منتقل ہوئی تھی اس میں غالب اور شبلی کے خطوط اپنی انفرادیت اور تنوع کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے۔ لیکن غالب اور شبلی کے بعد اردو خطوط کو مغربی طرز خطوط نگاری سے جس شخص نے آشنا کرایا وہ مہدی افادی

---

[1] صحیفۂ محبت ص ۲۱

ہیں۔ مکاتیب مہدی پر تبصرہ کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری نے مہدی کو اردو مکتوب نگاری کا کاؤپر (W. COWPER) قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ "مہدی کے خطوط بھی اسی طرح خلوص و صداقت سے معمور اور ریا اور تصنع سے خالی ہوتے ہیں جس طرح کاؤپر کے خطوط۔"

مہدی کے یہ خطوط واقعتاً ریا اور تصنع سے پاک ہیں مگر یہ دل لگا کر لکھے گئے ہیں۔ ان میں کاتب کا شعور بیدار ہے، وہ اس بات سے آگاہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط ایک دن زیور طبع سے آراستہ ہوں گے، اسی لئے ان میں کاوش اور اہتمام ہے۔

ان خطوط کی عام فضا علمی اور ادبی ہے اور ان کے مکتوب الیہم بیشتر وہ ادبا ہیں جن کی خلوت و عبوت کے مہدی شریک و سہیم رہے ہیں۔ لیکن بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن سے مہدی کی شخصیت اور ان کے مزاج و مذاق کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کے برعکس "صحیفۂ محبت" کے خطوط ظاہر سادگی اور سلامت کے حامل ہیں لیکن ان کا عام میلان ٹامس کارلائل (THOMAS CARLYLE) کے ان مکاتیب کی یاد تازہ کرتا ہے جو اس نے اپنی رفیقۂ حیات جینی ویلش کے نام تحریر کئے ہیں۔ مہدی اور کارلائل کے یہ خطوط ایک دوسرے کا ضمیمہ ہیں۔ ان میں مایوسی و نامرادی اور مہجوری و فراق کا رنگ تو ہے مگر یہ جذبہ بھی حاوی ہے کہ یہ چند روزہ مفارقت ہے اسی لئے ان خطوں میں قدرے سکون اور شادکامی و سرشاری کا انداز ہے۔

مہدی کے یہاں افکار تازہ کی وہ نمود نہیں جو ان کے بعض معاصرین کے یہاں نظر آتی ہے۔ پھر بھی مہدی باشعور اور ذہین تھے۔ اپنے افکار و جذبات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے کی ان میں بدرجہ اتم صلاحیت تھی۔ وہ ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اسی سطح پر آجائیں۔ یہ ایک انہونی بات تھی مگر مہدی کو اس پر اصرار تھا۔ وہ جس جذبہ احساس اور لطافت خیال کے

ساتھ ادب کے میدان میں اترے تھے اس نے انھیں ترسیل کا ایک پاکیزہ انداز بخشا تھا۔ یہ انداز ان کے ابتدائی مضامین میں کم مگر بعد ازاں اس قدر پختہ ہو گیا کہ شبلی کو یہ لکھنا پڑا "کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہو جاتے" مہدی نے اسی انداز و اسلوب کے سہارے زندگی، ادب اور سماج کے بڑے سے بڑے مسائل پر تنقید کی ہے۔ یہ ان کا مخصوص انداز ہے۔ اس میں شوخی و لکشتی بھی ہے اور رعنائی و جاذبیت بھی۔ اس کے ذریعہ انھوں نے ناگفتنی کو گفتنی بنایا ہے۔ شبلی، نذیر احمد اور آزاد مہدی کے بزرگ معاصر تھے۔ ان کا ادب مہدی کے لئے حرز جان تھا مگر مہدی نے شبلی کے علاوہ اگر کسی سے گہرے اثرات قبول کئے ہیں تو وہ میر ناصر علی ہیں۔ میر ناصر علی نے تیرہویں صدی سے ساتویں عام تک ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ اس سفر کے مختلف مقامات ہیں مگر منزل مقصود ایک ہے "عروس جمیل لباس حریر" کا فقرہ مہدی کے یہاں بار بار نظر آتا ہے۔ اس کی معنویت میر ناصر علی کی دین ہے۔ مہدی کے سہارے ادب العالیہ کا تصور پیدا کرتے ہیں، اور یہ تصور ہوئے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ تخلیقی ادب اور اس کی لسانی سطح کا ارتفاع چاہتے تھے۔

مطالعہ مہدی میں ان حقائق کو نظر انداز کر دینے کے سبب ہی یہ غلط فہمی رائج ہو گئی ہے کہ وہ صرف انشا پرداز تھے۔

(ڈاکٹر) فیروز احمد
لکچرر، شعبۂ اردو
راجستھان یونیورسٹی
جے پور
۱۵ فروری ۱۹۸۳ء

تمدن عرب پر ایک کھلی چٹھی

میرے پیارے ریاض! گورکھپور کے ایک دوست کے خط میں میں نے افسوس کے ساتھ دیکھا کہ ریاض الاخبار میں "تمدن عرب" کی نسبت جو نوٹ لکھا گیا تھا، اس سے وہاں کے لوگ بدظن ہو گئے ہیں۔ وہ استصواباً مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ "ریاض کا ریمارک کہاں تک درست ہے؟"

مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ آپ کا نوٹ اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے لیکن جہاں تک یاد آتا ہے آپ نے کسی اخبار کے حوالہ سے جو لکھا تھا، اس کی تفصیل غالباً یہ ہے۔

(۱) شمس العلماء مسٹر سید علی بلگرامی نے تمدن عرب میں حیدرآباد کی پالیٹیکس پر حملہ کیا ہے۔ اور یہ امر اس تعلق کے لحاظ سے جو ممدوح کو ریاست سے ہے کسی قدر ناموزوں تھا۔

(۲) اسی ضمن میں ترجمہ یا ترجمہ کی زبان کی بھی شکایت تھی، جو آپ نے کسی ہم عصر کے حوالہ سے لکھی تھی۔

تمدن عرب کے صفحے میرے سامنے ہیں اور میں حیرت میں ہوں کہ باوصف کوشش، الزام اول کا کوئی ماخذ اس وقت تک نہ مل سکا۔ مجھے خوف ہے آپ نے جو کچھ لکھا محض ایمان بالغیب کی حیثیت سے تھا، کیوں کہ باوصف اس اعزاز کے جس کے آپ مستحق ہیں میں مجبوراً اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ آپ نے بہ نفس نفیس کتاب کے کسی حصہ کے دیکھنے کی تکلیف نہ اٹھائی

ہوئی۔ اس لئے آپ کی طرف سے کسی رائے کا اظہار محض کسی غیر وقیع ہم عصر کی لغزش خیال کی پیروی تھی جو آپ کے لئے "ہوئے بس است" سے زیادہ گئی گذری ثابت ہوئی۔

جس امر کا الزامی حیثیت سے ابتداً کسی پرچہ نے نوٹس لیا اور بہ اتباع سنت آپ نے بھی اظہار خیال کی ٹھہرا دی، وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ مترجم نے دیباچہ میں جہاں ترجمہ کی مشکلات کا ذکر کیا ہے، کسی فرد گذاشت کے لئے اس بناء پر چشم پوشی کی خواہش کی ہے کہ ایک دیسی ریاست کے ملازموں کے لئے جہاں آئے دن کی درباداریوں اور انقلابات سے فرصت نہیں ملتی، اپنے فرائض منصبی کے علاوہ بہت مشکل ہے کہ وہ اتنی بڑی ضخیم تالیف کے بار سے تھوڑی سی مدت میں بوجہ احسن سبکدوش ہو سکے یہ ہے اصلیت اس الزام کی جس کو میں زیادہ سے زیادہ "مولفانہ گریز" کہوں گا۔

زبان کی نسبت آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ اردو اس ابتدائی حالت میں نہیں ہے جب شعراء کا ایک خاص فرقہ (جن کو میں نہیں جانتا ناظم کہہ سکتا ہوں یا نہیں) جس کے دل و دماغ کے نتائج انتہائی پرواز فکر کے ساتھ بھی صرف دو مصرعوں کی صنعت تک محدود ہوتے تھے، خود کو اردو کا مربی سمجھتا تھا۔ ایک شکمی زبان کے لئے جو کوئی مستقل حیثیت نہ رکھتی ہو، جس کا رسم خط آج تک ٹھیک نہ ہو، بدنصیبی سے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ زبان کے ساتھ خط کو کوئی مناسبت طبعی نہیں ہے یعنی زبان میں فطرۃً جو اصوات ہیں ان کو یہ بخوبی ادا نہیں کر سکتا۔ بہ الفاظ دیگر ہر لکھا ہوا لفظ ایک خاص خیال کی تصویر ہے جس کی آواز کو اس کے اجزائے ترکیبی سے چنداں تعلق نہیں ہے۔ یعنی حرکات بالحروف کی جگہ صرف چند اختراعی علامات کی وجہ سے جو سیاطبقی زبان کے خصائص میں سے ہے، ہم اردو کو جو آرین خاندان سے ہے، صحیح نہیں پڑھ سکتے اور اس لئے لازم سا ہے کہ کسی لفظ کے پڑھنے سے

پہلے ہم اس کے مفہوم سے واقف ہوں ورنہ بے علمی میں صحیح تلفظ ناممکن ہوگا غرض یہ کہ ایسی زبان کے لئے جس کا املا تک صحیح نہ ہو، متقدمین کی کوششیں کسی حیثیت سے ہوں، ہر طرح لائق ادب ہیں، لیکن زمانہ کا ہر قدم آگے ہے۔ ہم کو زری تک بندیوں کے سوا کچھ اور بھی کرنا ہوگا۔

میرا خیال ہے کسی مفتوح قوم کے لئے اپنی قومی زبان کو ترقی دینا صرف اس اصول پر ممکن ہے کہ زمانہ کی روز افزوں ترقی کے لحاظ سے اس میں وہ وسعت پیدا کی جائے جو قوم فاتح کے لٹریچر اور اس کی مختلف النوع شاخوں سے مل سکتی ہے۔ یعنی زبان کو علوم نظری اور فلسفہ کے اکثر نہیں تو بعض اجزاء سے مانوس کیا جائے، اور گو یہ ممکن نہیں کہ ابتداً علم کی اکثر شاخ میں متوازی ترقی ممکن ہو تاہم بعض اجزاء جن سے قوم کے اکثر افراد کو فطرۃً یا اکتساباً مناسبت ہو، اس قابل ہیں کہ وہ ہمارے ملکی لٹریچر میں جذب کر لئے جائیں جس سے اردو زبان بھی علمی حیثیت سے یورپ کی زبانوں سے ہم ردیف ہو۔ اس لئے ہماری کوششوں کا رجحان طبعی جہاں ہم علوم جدیدہ کو اصلی زبانوں سے حاصل کر سکتے ہیں، ملک کے عام فوائد کے لحاظ سے یہ بھی ہونا چاہیئے کہ یورپ کے فلسفہ کی کسی شاخ کو جو ترتیباً ہمارے لئے موزوں اور مفید ہو، اپنی زبان میں وقتاً فوقتاً منتقل کرتے رہیں۔ لیکن میں پہلے دیکھوں گا آیا ہم میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ ترجمہ کی حیثیت سے ہماری پیش دستیاں طفلانہ کوششوں سے کچھ زیادہ وقیع ہوں۔

ترجمہ، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو بعض حالتوں میں کسی مستقل تصنیف سے زیادہ مشکل ہے جس کی غایت اصلی یہ ہوتی ہے کہ مصنف نے اپنی زبان میں جس طرح اظہار خیال کیا ہے، مترجم بجنسہ ان خیالات کے سایہ میں اپنے الفاظ سے کام لے لیکن زور بیان ہاتھ سے نہ جائے۔ اس پابندی اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ دیکھیں گے کہ ہر زبان کے خصائص نوعی مختلف ہیں۔ جس طرح

ایک روزمرہ یا محاورہ، استعارہ یا تلمیح میں ایک خیال کو ادا کر سکتے ہیں، یہ ضرور نہیں کہ دوسری زبان میں بھی اسی قبیل کے الفاظ موجود ہوں۔ اس سے بھی زیادہ مشکل اصطلاحات کی ہے۔ صرف ایشیائی یا یوروپین زبانوں سے اگر ایک کا ترجمہ دوسری زبان میں ہو تو بہتیری اصطلاحات بجنسہٖ یا کسی قدر تصرف کے ساتھ کار آمد ہو سکتی ہیں اور اکثر ایسی مشترک خصوصیات ملیں گی۔ جن سے ترجمہ میں نہایت آسانی ہوگی، لیکن یورپ کے فلسفہ کو اگر ہم ایشیائی زبان میں لینا چاہتے ہیں تو ہماری دشواریوں کی کوئی حد نہیں رہتی۔ خاص کر اردو جو بجائے خود مستقل زبان نہیں ہے، تاوقتیکہ عربی مصطلحات سے مدد نہ لی جائے۔ علمی حیثیت سے کسی ترجمہ کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ یعنی ایک مترجم کے لئے اس کی ضرورت ہوگی کہ جہاں وہ مغربی زبانوں اور علوم جدیدہ میں کافی دستگاہ رکھتا ہے، صرف اردو کا ادیب نہ ہو، بلکہ اس کے اصلی ماخذ یعنی مشرقی علوم بالتخصیص سنسکرت اور عربی کا پورا عالم ہو۔ اس کے ساتھ ہی علم اللسان کی موشگافیوں سے پورا مذاق رکھتا ہو۔ مختلف زبانوں میں اصطلاحات یا الفاظ مرادف کے اشتقاق، ان کے استخراج اور خواصِ طبعی سے واقف ہو۔ اس جامعیت کے ساتھ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں، ملک کے علم دوست حضرات کے لئے کسی علمی ترجمہ کا کفیل ہندوستان میں بہ استحقاق سید علی بلگرامی کے سوا کون ہو سکتا ہے جو یورپ و ایشیا کی متعدد السنہ کے اکثر خاندانوں کا زبردست فاضل ہے۔

ان مسلّمات کے بعد جو تمہیداً بیان کئے گئے ہیں میں تمدن عرب کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں تاریخی فلسفہ کا بہترین نمونہ ہے اور میں اپنی اس رائے میں غالباً منفرد نہیں ہوں کہ ترجمہ کے لحاظ سے لائق سے لائق شخص کا انتہائی تخیل جو کچھ ہو سکتا ہے، کتاب اس کی پوری تصویر مرئی ہے افسوس ہے کہ میں اپنی مصروفیت سے اس قدر وقت نہیں پاتا کہ اپنے

دعویٰ کی دلیل میں اقتباسات کو پیش کر سکوں۔ یہ فرض ریویو نگار کا ہے جس کو غالباً مولوی وحید الدین سلیم معارف میں تفصیل کے ساتھ ادا کر چکے ہیں۔ میری غایت صرف یہ ہوگی کہ واقعی اوصاف کے ساتھ اس تالیف کی تقریب پبلک میں اس حیثیت سے کی جائے جس سے کسی غلط فہمی کا اگر قبل از وقت پیدا ہو تو استیصال ممکن ہو۔

بہر حال میرا دعویٰ یہ ہے کہ ترجمہ شستہ رفتہ، صاف اور اس قدر لطیف ہے کہ مستقل کتاب کا دھوکا ہوتا ہے یعنی اصل مصنف کے خیالات یا مسائل تاریخی اس طرح مترجم کے دماغ میں پیوست معلوم ہوتے ہیں کہ وہ مجدداً اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں ان کو بے ساختہ ادا کرتا ہے، اور یہی وہ امتیازی حیثیت ہے جو لائق مترجم کو مولفین کی عام رفتار سے بہت آگے ڈال دیتی ہے، لطف یہ ہے کہ ساری کتاب میں کہیں سے پیچیدگی نہیں، تعقید نہیں، نازک سے نازک فلسفیانہ بحثیں، معمولی روزمرہ جہاں تک ساتھ دے سکتا تھا۔ اس برجستگی کے ساتھ اردو قالب میں ڈھالی گئی ہیں کہ دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو کچھ اہتمام کرنا پڑا غرض دقیق سے دقیق مطالب بھی اجنبیت یا غربت الفاظ کے تابع نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ تاریخی لٹریچر کے لئے جس اسٹائل یعنی خاص طرز تحریر کی ضرورت ہے۔ وہ ضرورت کامل احتیاط کے ساتھ پوری کی گئی ہے، اور سخت چھان بین کے بعد بھی کوئی رکیک امر ایسا نہیں ملتا جو متانت تالیف سے گرا ہوا ہو۔ میں نہیں جانتا اس سے زیادہ ہماری توقعات کیا ہو سکتی ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ میرے مخاطب صحیح وہ لوگ نہیں ہیں۔ جو تمدن عرب میں وہ زبان ڈھونڈتے ہیں جو شوق یا قلق کی مثنویوں میں لکھی گئی ہے۔ یہ جاہلانہ گروہ سرے سے لائق التفات ہی نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ تاریخی فلسفہ کے لئے جس طرز تحریر کی ضرورت ہے وہ خود ایک مستقل اسٹائل ہے جس کی

اولیت کا فخر شبلی اور سید علی کے حصہ میں رہے گا۔ جو حضرات اپنی لکیر پیٹے جاتے ہیں۔ ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ "عمارت کی ترمیم ہوگی، یا عمارت خود نہ ہوگی"۔

مختصر یہ کہ میری رائے کا میلان طبعی یہ ہے کہ اردو زبان میں ایک قیمتی اضافہ کی حیثیت سے یہ کتاب مفروضہ نقائص کے ساتھ بھی اس لائق ہے کہ انیسویں صدی کے معظمات الامور میں محسوب ہو۔ بالتخصیص نفس مضمون کے لحاظ سے جو نہایت اہم اور قابل غور ہے لیکن کم سے کم نصف صدی کے بعد شاید یہ مذاق پیدا ہوگا کہ ہم اس قسم کی تالیف سے مانوس ہو سکیں جو میرے خیال میں بہ ہیئت مجموعی اس قدر دقت نظر چاہتی ہے کہ میں مایوس ہوں آیا ایک کم سواد شخص جس کا سرمایۂ ناز صرف اردو کی زباں دانی ہو، اس کی نگاہ ان فلسفیانہ نکات تک پہونچ سکتی ہے جو ترجمہ کے اجزائے کیمیائی ہیں۔

ان جزئیات کی تفصیل کے سلسلہ میں غالباً میں اس لائق ہو گیا ہوں کہ اختلافی مسئلہ میں ایک کافی حد تک آپ ہم سے اتفاق رائے کے لئے آمادہ ہو جائیں یعنی جس طرح ترجمہ کی ذمہ داریاں نہایت سخت ہیں، آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ صرف سید علی ہی اپنے عالمانہ اوصاف کے ساتھ ایسے ضخیم ترجمہ کا کفیل ہو سکتا تھا۔ اور اس لئے یہ سخت ناشکری ہوگی کہ اس کی قابل قدر کوششوں کا فیاضانہ اعتراف نہ کیا جائے۔

میرا خیال ہے کہ آپ نے نہایت بے پروائی سے ایک غلط رائے کی پیروی۔ لائق مترجم کی حق تلفی کے سوا یہ ایک شرمناک لغزش تھی کہ ایک ذمہ دار ایڈیٹر کا قلم ذاتی تحقیق سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا۔ جس سے پبلک کو غالباً اخلاقی نقصان پہونچنے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ میں نے آپ کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے کسی قدر سختی سے آپ کو ٹوکا ہے، مگر یہ پیرایہ خود کے اعزاز کی تائید

میں ہے جس کے لئے میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

میں نے قصداً ایسے امور نظر انداز کر دیئے ہیں جن سے انسانی تصنیف خالی نہیں ہو سکتی۔ کسی آئندہ موقع پر "تصویر کا رخ تیر گوں" بھی دکھلاؤں گا۔ سر دست میں نے صرف کتاب کی تقریب پر قناعت کی ہے کیوں کہ میرا خیال ہے بہ ہیئت مجموعی یہ ترجمہ ایک نہایت عظیم الشان کوشش ہے۔

اگر آپ پسند فرمائیں گے تو میں اپنی دوسری چھٹی میں تاریخی فلسفہ اس کے موضوع اور اس کی ضرورت سے بحث کروں گا اور دکھاؤں گا کہ یورپ کے تمام سرمایۂ تاریخی میں جو اقوام دنیا سے متعلق ہیں، اصل تصنیف (یعنی ماخذ تمدن عرب) کس پایہ کی ہے جس سے میرے احباب اندازہ کر سکیں گے کہ تاریخ عالم کے سلسلہ میں مسلمان فلسفیانہ اور تمدنی حیثیت سے نسبتاً کس درجہ پر ہیں، ایشیا کے لئے یہ بالکل ایک جدید بحث ہے، جس کے لئے ہم کو یورپ کا بہت ممنون ہونا چاہیئے۔

علامہ نذیر احمد، ایل ایل ڈی
اور
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

ملک کے اس فاضل اور نہایت زبردست ادیب کو ہم نے شروع شروع اس حیثیت سے جانا کہ چند کتابیں عورتوں کے فوائد اور عام واقفیت کے لئے ان کے قلم کے سایہ میں نکلیں۔ رفتہ رفتہ یہ سوسائٹی کے نمایاں نقائص کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک سلسلہ مفید تر تصنیفات کا شائع ہوتا رہا، جسے ملک نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ "رویائے صادقہ" جو اس سلسلہ کی سب سے پچھلی کتاب ہے، بالتخصیص لایق ذکر ہے۔

تاہم بہیئت مجموعی اس درمیان یہ زیادہ سے زیادہ ناولسٹ رہے، لیکن جس زمانہ سے ان کے لیکچر شروع ہوئے، ان کی غیر معمولی قابلیتوں کے جوہر بتدریج کھلنے لگے۔ ناولوں کی بنیاد چونکہ اسلامی اخلاق پر رکھی گئی تھی، اس لئے وہاں بھی سنجیدگی کی کمی نہیں تھی مگر لیکچروں نے بتایا کہ ان کی متانت تصنیف سنجیدہ تر امراض علمی کے لئے زیادہ تر موزوں تھی۔ اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ، بے مثل قدرت بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدت خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اس شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی جان ہیں۔ اس پر اضافہ کیجئے اردو جیسی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا جس پر کلاسیکس کا دھوکا ہو، ان کو "فادر آف اردو" زبان مان لینے سے پہلے تسلیم کرنا ہوگا کہ مشرقی لٹریچر (عربی، فارسی) ان کے لئے زبان غیر

نہیں اور جب ماخذ پر اس قدر عبور رہے تو اردو تو صرف اپنی چیز ہے لیکن باوصف ان کے وقیع عالمانہ اوصاف کے جو ایک حد تک ان کے ہم عصروں کو مرعوب کرنے والے ہیں، میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاق سنجی کی آزمائش کا بہترین پیرایہ کیا ہو سکتا ہے، جس طرح یہ پرانے ناولسٹ اور نئے لیکچرار ہیں، ممکن ہے کہ لٹریچر کی کسی صنف میں جو اس سے بھی زیادہ اہم ہو یہ کوئی کام بڑا کر سکیں۔

بے شک ترجمۂ قرآن ایک مہتم بالشان کوشش ہے، جس کے لئے آئندہ نسلیں بھی ان کی ممنون گی، تاہم میں نہیں جانتا، ان سے کیا چاہتا ہوں۔ غالباً کوئی مستقل سلسلۂ تصنیف جس میں گہرا، اعلیٰ اور فلسفیانہ رنگ ہو۔ تاریخ شبلی کے حصہ میں رہی، بیاگرفی حاتی لے بیٹھے اور دونوں حضرات سچ یہ ہے کہ اپنا پوزیشن قائم رکھنا خوب جانتے ہیں۔

یہ کچھ نہ کرتے، آں حضرت (صلعم) کی ضخیم لائف لکھ دیتے تو زبان اور خیالات دونوں کا حق ادا ہو جاتا۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ طرز تحریر کے لحاظ سے بیسویں صدی کی تالیف ہو۔ بعض لوگوں کو غالبؔ کی طرح ان کی مشکل پسندی کا رونا ہے، اور وہ پیوند کاریاں جو ان کی شستہ و رفتہ اور برجستہ اردو میں ہوتی رہتی ہیں، جس میں انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے، عام خیال یہ ہے کہ ثقل سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سب ان کی جدّت اور اختراع اور قوت آخذہ کا زور ہے۔ آمد کی رو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی، اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بہ لحاظ ترکیب و تحلیل اجزائے السنۂ غیر، گنگا جمنی ہوتے ہیں۔ تاہم متانت اور حسن کلام سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتے، جو ان کی کلاسکل لٹریچر کا خاصہ طبعی ہے۔ نہ ان کے اچھوتے اور مستقل اسٹائل پر کوئی اثر پڑتا ہے، جو شارع عام سے بعید اور آپ اپنی نظیر ہے۔ جو باتیں اوروں کے ہاں بیگانی ہیں، ان کی بیساختگی اور

برجستگی خیال کے ساتھ سلسلۂ بیان میں اس طرح جذب ہو جاتی ہیں۔ کہ مغائرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر بھی جہاں تک اس حیثیت سے اعتراض کی گنجائش ہے، ادب چاہتا ہے سبک نکتہ چینیوں سے ان کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

ہاں! ان لیکچروں کے متعلق ایک بات کھٹکتی ہے، یہ مجموعہ جہاں تک اسلام اور تعلیم کا تعلق ہے، ایک زبردست سرمایۂ علمی ہے، اور اس لائق کہ قوم کے لکھے پڑھے لوگ اسے پیش نظر رکھیں۔ اسلام کے اصلی مشن یعنی توحید کو حشو و زوائد سے علیحدہ کر کے اس کی اصلی وسعت میں اس خوبصورتی سے پیش کرنا جو فسانۂ دلچسپ کی حیثیت رکھتا ہو اور جس سے بہتر کوئی پیرایہ خیال میں نہیں آسکتا، لیکچرار کی معرکۃ الآرا کامیابی ہے مگر عموماً ان کے لیکچر کوئی مستقل عنوان نہیں رکھتے جس سے یہ اندازہ کرنا ممکن ہو کہ کہاں تک نفس مضمون کی حیثیت سے یہ خارج از موضوع یا حدود مقررہ کے اندر ہے۔ جس طرح پڑھنے والے کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کسی خاص موضوع پر وہ کچھ دیکھ رہا ہے، لکھنے والے کی بھی کوئی غایت صریحی معلوم نہیں ہوتی ایسی حالت میں ان کا ہر لیکچر اگر میں غلطی نہیں کرتا تو خود در و ریمارکس کا ایک مجموعہ ہے جس میں مقصود بالذات صرف قوم کی حالت یا اس کی ضروری اغراض پر کچھ کہہ سن دینا ہوتا ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی طبیعت میں استطاعت فطری یعنی صلاحیت نہیں ہے کہ خیالات کو کسی خاص عنوان کا پابند کر سکیں۔ ان کا مرتبہ انشا پرداز چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ قصور صرف زور بیان کا ہے۔ جو اظہار فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اکثر ٹو دی پوائنٹ نہیں ہوتے۔

اس خاصہ نے ان لیکچروں کی وقعت کو کسی قدر نقصان پہونچایا ہے جو

اپنے خصائص نوعی کے ساتھ بھی اتنے اہم ہیں کہ آج قوم کا خدا نے نثر لٹریری دنیا میں جہاں تک کہ پاکیزہ اور سلجھے ہوئے خیالات کے ساتھ بے مثل فصیح البیانی اور دقیع انشا پردازی کا تعلق ہے، اپنے معاصرین سے علانیہ ممتاز ہے مگر یہ کمال جس کا حصۂ غالب اکتسابی نہیں بلکہ وہبی ہے ان کے دل و دماغ کے نتائج کو اور زیادہ ابھار کر دکھاتا، اگر متفرق عنوانوں کے تحت میں تمام ضروری امور وقتاً فوقتاً زیر بحث رہتے جن کا تعلق ہماری مذہبی، اخلاقی اور دماغی تہذیب و تربیت سے ہے اور وہ مسائل جن کی موجودہ سوسائٹی کو بوجوہ سخت ضرورت تھی، ایک ایک کر کے طے کر دیئے جاتے، جن میں من حیث الموضوع اتنی جامعیت ہوتی کہ ہر مضمون ایک قول فیصل ہوتا۔

میری یہ توقعات مصنف کے درجہ کے لحاظ سے زائد از استحقاق نہیں ہیں۔ دیسی سوسائٹی کے نقائص اور فطرت انسانی کے وہ دقیق راز جو بہ سبب غایت ظہور کے، عام نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، فاضل ادیب کی نگاہ جیسی گہری ان پر پڑتی ہے، تقلیداً بھی اوروں سے ممکن نہیں۔ ثبوت کے لئے دیکھئے "رویائے صادقہ" کا وہ حصہ جہاں دہلی کی سوسائٹی کا خاکہ کھینچا ہے، میرے خیال میں دو سطریں بھی اس سے بہتر نہیں لکھی جا سکتیں، یہ ایک سرسری نمونہ ہے ان قیمتی آثار کا جو قریب قریب ان کے ہر حصۂ تصنیف میں مل سکتے ہیں۔ بہرحال کثرت سے مختلف عنوانوں پر لکھنا ایک ضرورت ہے جس کی رعایت اگر نہ کی گئی تو باوصف صنائع لفظی و معنوی اور فاضلانہ تراش خراش یعنی غایت نکتہ سنجی کے جو بہ ہیئت مجموعی لیکچروں کی روح رواں ہے، یہ مجموعہ من حیثیۃ الفن لیکچرار کے مرتبۂ کمال کو دیکھتے گرا ہوا رہے گا۔ پچھلے لیکچروں کو دیکھئے، کثرت تعداد اور ایک ہی قسم کے خیالات باختلاف الفاظ ملیں گے اور گوظرافت اور طباعی ان مجموعۂ الفاظ میں ہمیشہ تصرف کرتی رہتی ہے، جو بار بار ایک ہی موضوع پر کئے

گئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشکل سے ان کی نثر کا کوئی حصہ بار ہوتا ہے۔ لیکن نرے الفاظ کتنے ہی خوشگوار لباس میں ہوں، نفس مضمون کی سستی اور ہم طرحی کی کہاں تک تلافی کر سکیں گے۔

اس ضمن میں مجھ کو بالتخصیص ان سے جو شکایت ہے، یہ ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کی برکات یعنی ان فوائد کے ذیل میں جو ملک کو پہونچتے ہیں، یہ عادتاً قریب قریب ہر لیکچر میں جن اہم چیزوں کا ذکر کرتے ہیں، وہ سوئی، پیچک، دیا سلائی اور چاقو وغیرہ وغیرہ یہی سب ہوتی ہیں جو ادنیٰ درجہ کے بساطیوں کے مقابلہ میں ان کے ہاں زیادہ سستی ہیں یا تو ان چیزوں سے اتنی مساوات ہو گئی ہے کہ انیسویں صدی کی ایجادات میں انھیں سر فہرست دیکھنے کو جی نہیں چاہتا یا واقعی یہ ہے کہ ان کی انشا پردازی ان چیزوں کے ناموں سے ہم سطح نہیں ہو سکتی۔ بہر حال کثرت توارد گراں گزرتا ہے نظر ثانی میں یہ حصہ نکال دیا جاتا تو اچھا تھا۔

اس کا بھی افسوس ہے کہ ان کے لیکچر اب زیادہ سے زیادہ ترجمۂ قرآن کے اشتہار ہوتے ہیں۔ پھیکے، بے لطف جن میں نسبتاً کوئی جدت نہیں، دلچسپی نہیں۔ خیال کے ساتھ الفاظ کا ذخیرہ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ختم ہو چلا۔ حالانکہ ہمارا آخری سہارا یہی تھا کہ مختلف موقعوں پر جو کچھ ان کی زبان و قلم سے نکل جائے ہمارے لئے پھر بھی ایک چیز ہوگا۔ میں نے نہایت غور سے یہ بات پیدا کی ہے کہ جس طرح ناولوں میں بہ رعایت فن یہ اپنی قادر الکلامی کی وجہ سے بے تکلف اظہار خیال کر سکتے ہیں، لٹریچر کے وہ اجزاء جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے (مثلاً تاریخ وغیرہ) جن میں وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید، قوت استقراء تفریع مسائل، حسن ترتیب اور غیر منقطع القیاط خیال کی ضرورت ہے، یہ قصداً اس طرف نہیں آتے۔ یہ وہی آزادی ہے جس کا اثر لیکچروں پر دکھایا گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی طرف سے

کسی ضخیم تالیف کے فوائد سے جو ان کی مستثنیٰ قابلیت کے دیکھتے ہوئے ہمارا انتہائی تخیل ہو سکتی ہو آج تک محروم رہے۔

حدیث و سیر میں ان کی وسیع النظری جس کا لوہا مانا جاتا ہے، میں نہیں جانتا اس وقت تک کار آمد ہو سکتی ہے، جب تک مذہبی تحقیقات کی بنیاد جدید علم کلام یعنی انیسویں صدی کے سائنس پر نہ رکھی جائے، لیکن ان کے لائق رشک دل و دماغ کا جو مصرف میں نے سوچا ہے، اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا میں نے ان کی موجودہ تصنیفات کو ان کے مرتبۂ کمال کے مقابلہ میں اگر غیر کافی سمجھا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ آج جتنی عظمت ان کی میرے دل میں ہے۔ میں خود اس کے صحیح اندازہ سے قاصر ہوں۔ جب تک شمس العلماء تھے خیر ایک بات تھی، اب ڈاکٹر ہوئے، اور کسی طرح مدمعولی میں نہیں آتے۔ تصنیفات میں بھی لازماً حکیمانہ رنگ ہونا چاہیئے۔ اس لئے نہایت مناسب ہوگا اگر یہ اردو میں "قاموس الاسلام" لکھ ڈالیں۔ میری مراد ایک ایسے مجموعۂ لغات سے ہے کہ جس میں تمام الفاظ و اصطلاحات جو اسلام سے مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی یعنی کسی حیثیت سے کوئی تعلق رکھتے ہوں، بہ ترتیب حروف جمع کر دیئے جائیں اور ہر لفظ کے مقابلہ میں داد تحقیق دی جائے۔ معمولی لغات میں ہم کو صرف مادہ الفاظ لغوی اور اصطلاحی مفہوم روزمرہ اور محاورہ یا اسی طرح کے اور سرسری امور سے غرض ہوتی ہے، مگر انسائیکلوپیڈیا میں مصطلحات ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر لفظ کی گویا ایک مختصر سی تاریخ لکھنی ہوگی اور بہ لحاظ نوعیت جس قسم کی معلومات درکار ہوں گی بحث کا کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پائے گا۔

طرز تحقیق جہاں نری زباندانی سے کام نہ چلے، کہیں مورخانہ ہوگا، کہیں محدثانہ اور کہیں دونوں پہلوؤں سے الگ عالمانہ اور مجتہدانہ روش ہوگی، جو امور تاریخ سے متعلق ہیں، ان میں وہ شہادتیں کافی ہوں گی جو عام مورخین

کے نزدیک مسلّم اور متفق علیہ ہیں، جو مسئلہ محدثانہ پہلو رکھتا ہے اس میں زیادہ تر تدقیق کرنی ہوگی۔ اور تمام پرانے اصولوں سے کام لینا ہوگا۔ جو محدثین نے اخبار و روایت کی تنقید کے لئے قرار دیئے ہیں، مگر تحقیقات کے سلسلہ میں وہ الفاظ و اصطلاحات جن کے تحت میں روایات ضعیف اور دور از کار قصے قدیم تفسیروں میں بھرے ہوئے ہیں ان کی تدقیق قطعاً اصول عقلی اور لاآف نیچر سے کرنی ہوگی، ورنہ یہ تالیف مخصوص صفات کے ساتھ بھی ایک مجموعۂ بے کیف یا تقویم پارینہ سے کچھ ہی بڑھ کر رہے گی، اور یہ منظور نہیں۔

صائب الرائے مصنف کا اسلامی علوم، یعنی قرآن، حدیث، فقہ، مغازی، مذاہب سلف، لغت، قیاس وغیرہ میں زائد از کافی دستگاہ رکھنا ایک کھلا ہوا راز ہے، جس پر کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں اس پر ان کی غیر معمولی ذہانت بلکہ استخراج اور تدوین و استدلال کی وقعت کو بڑھائیے تو جامعیت کا دائرہ بوجہ احسن پورا ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ میری خاطر سے مان لیجئے کہ منتشر معلومات کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہوتا ہے، جو کسی خاص سلسلہ میں مدوّن نہیں ہو سکتا، اور عموماً بیکار ہو جاتا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ میرے مخاطب صحیح کو ابتدائی درس و تدریس کے زمانہ سے آج تک جب وہ ایک گرانپایہ مصنف اور لیکچرار کا درجہ رکھتے ہیں، بہتیرے نہایت دلچسپ مواقع تحقیق پیش آئے ہوں گے جن کے نتائج ان کے سینہ میں کچھ مقفل ہیں، کچھ تلف ہو گئے۔ میرے خیال میں صرف پیش کردہ تالیف میں یہ وسعت و استعداد ہے کہ وہ ان کے عمیق جذبات اور مخفی قابلیتوں کو ہیجان میں لائے جس سے دفینۂ غیر محسوس یعنی معلومات متفرق کا ہیولیٰ مجموعی یعنی کتابی صورت پیدا کر سکے۔

مختصر یہ کہ اس تقریب سے ایک بیش بہا مجموعہ تیار ہو جاوے گا اور

ایک ایسی ضرورت رفع ہو جائے گی جس کی علامہ نذیر احمد کے ہوتے، کسی اور سے امید کرنا ان کی حق تلفی کرنی ہے۔ یہ لٹریچر کے گراں وزن حقوق سے سبکدوش ہو جاویں گے اور ملک و قوم کو جو فائدہ پہونچے گا، وہ متعدی اور متوارث ہوگا۔

قوم کے نوجوانوں کے لئے جہاں دماغی اور عقلی ترقیوں کی آج کل کوئی حد نہیں ہے، مذہبی عنصر جو قومیت کی روح ہے قریب قریب فنا ہوتا جاتا ہے اور ایک وقت آئے گا جب انتہائے مغربی خیالات کے ساتھ ہماری نئی پود معمولی مذہبی الفاظ سے ناآشنا ہوگی جو اسلام کی حق تلفی کا بدترین پیرایہ ہے۔

اگر سویلیزیشن اور سائنٹفک ترقیات کے ساتھ بھی بقائے مذہب کی ضرورت ہے۔ تو میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ سب سے پہلے جدید نسلوں کے ہاتھ میں ایک ایسی تالیف دینی ہوگی جو جامع معقول و منقول ہو۔ اور جس میں اسلام کے اصول و فروع پر حصول اطلاعات کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہو انھیں آئندہ صدیوں میں واقفیت عامہ کے لحاظ سے ہمارا بہترین رہنمائے مذہب ہو سکے۔ گو اس تالیف کی نسبت دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ عام پسند ہوگی۔ بہ الفاظ غیر، امید نہیں کہ مؤلف کو مالی حیثیت سے کافی معاوضہ مل جائے، لیکن میرے خیال میں بہ لحاظ اس شریفانہ غایت کے جو تالیف کا مقصود ہے، اس حیثیت سے قطع نظر کر لینی چاہیئے، اس کا خاص پسند ہونا بجائے خود ایک قیمتی صلہ ہے، جو اولوالعزم مؤلف کو اگر میں صحیح رائے قائم کرنے کے لائق ہوں۔ مالی قدردانی کی طرف سے قطعی بے نیاز کر دے گا۔

ایک انگلش پروفیسر نے انگریزی میں ضخیم ڈکشنری آف اسلام لکھی ہے، جو کہ دو پونڈ دو شلنگ کو ملتی ہے۔ اس کا جدید اڈیشن آج کل میرے مطالعہ میں ہے۔ مگر یہ ایک ایسے شخص کی تحقیقات کا نتیجہ ہے جس کو ظاہراً اسلام میں

پیغمبرؐ اسلام سے کوئی ہمدردی نہیں معلوم ہوتی اور گو اس کی مرتب تحقیقات کا ماخذ اصلی تصنیفات یعنی عربی کتابیں ہیں تاہم اکثر موقعوں پر وہ میوریا اور متعصب عیسائی عالموں کا ہم آواز ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو مہتم بالشان مسائل تھے ان ہی میں دانستہ ٹھوکریں کھائی ہیں، پھر بھی تحقیق اور دقت نظر کی حیثیت سے اس قابل قدر مجموعہ کے مولف کی کوششیں ہر طرح لایق اعتراف ہیں۔ بہرحال ڈاکٹر نذیر احمد کی جامعیت پکار رہی کہتی ہے کہ "انسائیکلوپیڈیا" کی تکمیل کے لئے ان کو اپنے دائرۂ معلومات کے نتائج جس حد تک وسیع کرنے ہوں گے، ان کا کفیل دنیائے اسلام میں ان سے بہتر شاید کوئی نہیں ہو سکتا۔ صرف یورپ سے میٹریل فراہم کرنا ہوگا اور یہ ان کی زائد از ضرورت خوش حالی اور فرصت کو دیکھتے بڑی بات نہیں۔

مجھ کو اعادہ کرنا پڑتا ہے کہ تبحر علمی، فطری ذوق مناسبت، تحقیق کی کاوش اور دقت کامیابی جو ان کے خصائص میں سے ہے، یہ وہ اسباب ہیں جن سے بہتر اس تالیف کے لئے خیال میں نہیں آسکتے اور جب یہ دیکھتے کہ تحقیق کا سلسلہ ہر لفظ کی ضروری تشریح کے ساتھ ختم ہو جاوے گا تو نسبتاً ان کے لئے آسانی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ میرا خیال ہے ملک کے اس رفیع المرتبت انشاپرداز کی یادگار، جس سے آئندہ نسلیں کوئی صحیح اندازہ کمال کر سکیں "قاموس الاسلام" کے سوا اور کچھ نہیں ہے، جس طرح ملک آج ان کا لوہا مانتا ہے، یورپ میں بھی استفادتاً ان کی ارجنل تحقیقات اور تلاش کے ثمرے عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ زمانہ کتنی ہی ترقی کرے، اس علم کے پتلے کو پیدا نہیں کر سکتا جس کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں۔ جہاں تک لایق ادب مشرقیت کا تعلق ہے، قوم کی یہ آخری بہار تھی جس کے اجزا کچھ اٹھ گئے کچھ باقی ہیں۔ قدیم علوم کے نام لیوا دو چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ جس مربی مرحوم عربی کو آج ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈتے ہیں۔ علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہو جائے گی،

مگر میرے منھ میں خاک، ان کا حصۂ غیر فانی یعنی "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مرنے والی چیز نہیں۔ وہ اپنی بقائے دائمی کی آپ ضامن ہے۔ اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخیل ہو سکتا ہے، جس کی طرف میں ان کو تھوڑی دیر کے لئے متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

دائرہ ادبیہ

بخدمت جناب خان بہادر سید ناصر علی صاحب بالقابہ ایڈیٹر

صلائے عام دہلی

جناب من، یاد فرمائی کا شکریہ! پرچے دیکھے، مدت کی چوٹ جو دل کا چور بنی ہوئی تھی ابھر آئی۔ میں آپ کے لٹریچر کا اس وقت سے دلدادہ ہوں جب لٹریچر کا صحیح مفہوم بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ کم و بیش بیس برس ہوئے جب آپ نے ایک وضع خاص پر لکھنے پڑھنے کا مشغلہ جاری کیا یعنی "تیرھویں صدی" میں داد سخن دی۔ "تہذیب الاخلاق" کے ساتھ آپ نے جس ٹھاٹھ سے دھواں دھار مضامین لکھے اور سرسید کے لٹریچر پر جس سلیقہ اور سخن گسترانہ شوخیوں سے آپ نے انتقادات کی ٹھہرائی، سچ یہ ہے کہ وہ اردو لٹریچر کی جان ہیں۔ آج سنجیدگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میں نہیں جانتا ملک کے نامور اہل قلم آپ کے گذشتہ کمالات کی داد دیں گے۔ لیکن میں کھل کر کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس وقت انشاپردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے۔ آپ کا ادنیٰ مذاق اور خاص طرح کا مادۂ اختراعی (اوریجینلٹی) دراصل آپ کے اولیات میں داخل ہونے کے لایق ہے۔

موجودہ نسل تمام تر "تہذیب الاخلاق" کے ادبی دور کی پیدا کردہ ہے۔ جب آپ کے لٹریچر کا شباب تھا اور یہیں سے اپنا مرتبہ دیکھ لیجئے۔

تیرھویں صدی[1]" میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں آپ کا عنصر غیر فانی ہے لیکن افسوس ہے آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ جس سے پچھلے دنوں اتنے دماغی سابقے رہے وہ بہ ہیئت مجموعی کتابی صورت میں جلوہ گری کا حق رکھتی۔ اس پاکیزہ مجموعے کی ترتیب سے اردو ادب العالیہ (کلاسیکس) میں آپ کی طرف سے مستقلاً قیمتی اضافہ ہوتا جو یادگار زمانہ رہتا۔ آپ معاف فرمائیں گے یہ بدترین حق تلفی تھی جو آپ اپنی کر سکتے تھے۔ یہ خیال قطعاً صحیح نہیں ہے کہ ملک میں اچھے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں۔ نئی نسل کو آپ کی اردو سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ نہ بہ ہیئت موجودہ کسی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ آئندہ کچھ کر سکے۔ صاف بات یہ ہے کہ جس لٹریچر پر آپ مٹے ہوئے ہیں، سرے سے اس کی جان ہی کے لالے ہیں جس زبان کی حیات طبعی بوڑھے نذیر احمد اور حالی و شبلی کے دم تک ہو وہ سسک سسک کر کب تک چل سکتی ہے؟ آپ سے کچھ امیدیں تھیں مگر اس وقت تک آپ کا صحیح مصرف کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ سنتا تھا لٹریچر بڑھاپے میں جوان ہوتا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں آپ کے ساتھ آپ کی طبیعت کا رنگ بھی کچھ بدل سا گیا ہے، یعنی خیالات میں ایک طرح کی بے نمکی پائی جاتی ہے اور وہ بات نہیں رہی جو کبھی پہلے تھی۔ شاید اس لئے کہ "تہذیب الاخلاق" کی طرح کوئی چیز الجھاؤ پیدا کرنے والی نہیں رہی یعنی جذبات کے اکسانے کا سامان نہیں رہا۔

ملک میں اچھے لکھنے والے کم ہیں ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آپ کے رنگ میں دو سطریں بھی لکھ سکیں۔ مرحوم ریاض (خدا اسے مدتوں زندہ رکھے) اور

مرتب [1] میر ناصر علی دہلوی کا پہلا رسالہ جو آگرہ اخبار آگرہ سے ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا۔ "اس رسالے میں اسلامیات کے مختلف موضوعات پر تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے اور بیشتر "تہذیب الاخلاق" کے نیچری عقائد کے مضامین پر تنقید کی جاتی تھی۔" بحوالہ مقامات ناصری ص ۶۴۴، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۹ء۔

برہم دا شہری کے دل سے پوچھئے، ناصر علی پھر کہاں؟ "صلائے عام" کی ترکیب باوصف حسن ظن کے جو آپ کی طرف سے ہے، کچھ پسند نہ آئی۔ اس سے تو ناصری اچھا تھا۔ "خاصے" کی چیز اور "وقف عام" ایک طرح کا بے تکا پن ہے۔ اس سے آپ کے مذاق انشا پردازی پر نکتہ چینی منظور نہیں بلکہ آپ کو اپنے ڈھب پر لانا ہے بیسویں صدی میں جو پرچہ آپ سے باکمال کے قلم کے سایہ میں اور وہ بھی عروس سخن کے میکے یعنی دلی سے نکل رہا ہو اس کا نام میں آپ کی جگہ ہوتا تو بے سوچے سمجھے "ارتقا" رکھ دیتا۔ نام اتنا باکیف تو ہو جس سے پرچے کی علت غائی یعنی آپ کے ادبی تخیل (لٹریری آئیڈیل) کا پتہ چل سکے۔ تقطیع مجھے پسند نہیں۔ ولایت کے نامی رسالے تو آپ کے پیش نظر ہوں گے۔ دور کیوں جائیے؟ "الندوہ" کی نصابی تقطیع اختیار کیجئے جو نہایت موزوں ہے۔ بہنوں کا بھی کھاتہ ٹھیک نہیں۔ یہ لکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ قدردان کہاں سے آئیں گے؟ موجودہ نسل آپ کو نہیں جانتی یا کم سے کم میری طرح نہیں جانتی اور یہ آپ ہی کا قصور ہے لیکن "ہر فعل خود اپنی مکافات ہے۔" دنیا میں رہنے اور اچھی طرح رہنے کا اسی قدر حق ہے کہ جس طرح ہو اپنی مستقل یادگار چھوڑ جائیے اس کی چلتی ہوئی ترکیب یہ ہے کہ تیرہویں صدی اور متفرق پرچوں میں آپ نے جو کچھ لکھا لکھایا ہے۔ اہتمام کے ساتھ ایک دم سے شایع کر دیجئے۔ لیکن مضامین غیر نہ ہوں۔ آب رواں میں گاڑھے کا پیوند بے جوڑ رہے گا۔ اگر یہ نہ ہوا تو میں سمجھوں گا میرے منھ میں خاک! آپ جیتے جی مر گئے۔ اور لٹریچر کے خون ناحق کا بار گراں جو گردن پر رہا وہ علیحدہ۔ یہ اصرار آپ کے خاص مرتبۂ انشا پردازی کے لحاظ سے ہے۔ آپ کی زبان اپنے مختص النوع صفات کے ساتھ کسی اور کے بس

---

[1] میر ناصر علی نے متعدد رسائل جاری کئے تھے۔ ناصری ان میں سے ایک رسالہ کا نام ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۸۸ء میں جاری ہوا۔ مرتب

کی چیز نہیں اور سچ یہ ہے کہ آپ اپنے فن کے اختصاصی (اسپیشلسٹ) ہیں
میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافت خیال پاتا ہوں۔ آپ کی چشم سخن جہاں
"جنس لطیف" اور اس کے متعلقات کی طرف اشارے کرتی ہے وہ نزاکت
خیال کی آخری حد ہے۔ تیرہویں صدی میں ہیترے نشرہ ہیں جو آج تک دل
میں چبھ رہے ہیں۔ ابھی ابھی ایک فقرہ نظر سے گذرا، "یہ پان ان کے لئے
ہے"۔ بے اختیار جی بھر آیا۔ اگلے پچھلے قصے پیش نظر ہو گئے۔ پوچھئے تو بتا
نہیں سکتا لیکن کچھ تو ہے جو دل پر چوٹ لگی، رکھ رکھاؤ اتنا تو ہو، ایک چھوٹا
سا فقرہ اور عطر زندگی!

بوڑھے حالی جو شاعرانہ جذبات کے ساتھ بھی عورت تو خیر "چھوٹے
کپڑے" سے گھبراتے ہیں، اس قسم کی نزاکت خیال کو پسند نہیں کرتے، لیکن
انشاپردازی ان سے کبھی قطع نظر نہیں کر سکتی۔ شوق کی مثنویوں میں سے اگر زوائد
کو نکال ڈالئے تو کچھ بچ رہے گا، فلسفۂ اخلاق کی جان ہوگا ؎

یاد اتنی تمہیں دلاتے جائیں
پان کل کے لئے بناتے جائیں

ان سیدھے سادے مصرعوں میں جو رکھ رکھاؤ ہے کسی رازدار فطرت
سے پوچھئے، کیا دنیا کی شاعری اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے؟ یورپ میں جو آج
بڑے پایہ کے لکھنے والے ہیں۔ اُن میں مذاق حسن پرستی اس قدر رچ گیا ہے
کہ قریب قریب ان کی ہستی کا ایک جزو ہو رہا ہے۔ عورت جسے "خواب طفلی اور
آرزوئے شباب" کہئے، "ہر بات تری فسانۂ حسن" ہیئت اجتماعی (یعنی سوسائٹی)
کی روح رواں ہو رہی ہے جس سے کوئی شائستہ لٹریچر دست بردار نہیں
ہو سکتا، آپ ان نزاکتوں سے خوب واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ

"عکس رخ موتیوں کے دانوں میں"

صنف نازک" آپ کے دائرۂ تحریر میں کسی نہ کسی حیثیت سے آ ہی جاتی ہے۔

مہرالنساء کا وہ واقعہ کس قدر دلچسپ ہے جب اس نے باغ کی ایک روش پر جہانگیر کے ہاتھ سے کبوتر لے کر چھوڑ دیئے تھے۔ پروفیسر آزاد نے جس خوبصورتی سے اس کو دکھایا ہے، انشاپردازی کو آج تک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے، آپ وہ سماں دکھایئے۔ جب مہرالنساء "جوان بیوہ" کی حیثیت سے شاہی محل میں رہنے سہنے لگی ہے، لیکن ہائے وہ حسن افسردہ جو خود اپنی قوتوں سے واقف ہو، خوب جانتی تھی بجلی کدھر گرے گی۔

شب امید بہ از روز عید می گردد

کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتہ است

جہاں گیر ایک روز اس کے کمرہ میں جا نکلا جو ضیائے حسن سے "شیش محل ہو رہا" تھا۔ حور وش کنیزوں کے حلقہ میں زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے تھے۔ فطرت کی لاڈلی "ہمہ غمزہ ہمہ عشوہ ہمہ ناز، نہایت سادے باریک سفید لباس میں تھی، لیکن شیشے کی طرح صاف شفاف جسم جھلک رہا تھا۔

کلائی وہ نازک سی ہیرا تراش

وہ محرم میں سربستہ اک راز فاش

"مقیاس الشباب" کی سرکشی بتا رہی تھی کہ وہ دستانے کی طرح چھبتی ہوئی محرم سے زیادہ اودی اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے، اس پر وہ کافوری سر برہنہ حصۂ افقی! خیال کے لئے کیا باقی رہا؟ غرض مہرالنساء عالم تصویر بنی ہوئی تھی۔ شاہی نگاہیں جم کر حسن عریانی کا جائزہ بھی نہ لینے پائی تھیں کہ ایک کہربائی قوت نے بجلی کے تاروں میں نہیں، زلف عنبریں کے پیچوں میں "جہاں پناہ" کو جکڑنا شروع کیا۔ شاہانہ تمکنت نے دیکھتے دیکھتے حسن گلوسوز سے شکست کھائی، جہاں گیر سے ضبط نہ ہو سکا۔ دل کا چور زبان پر یوں آیا۔

"تمہارے اور تمہاری لونڈیوں کے لباس میں کیوں فرق ہے؟"

اس کا جواب جو کچھ ملا، اسی کا حصہ تھا جو آگے چل کر نورجہاں ہونے والی تھی۔

"جی میرا لباس لازماً اوروں سے مختلف ہوگا۔ کیوں کہ اسے شاہی خواہشات کے زیر اثر ہونا چاہیئے۔"

ذرا دیکھئے گا، کیا کہہ گئی؟ جتنا کہا نہیں اس سے زیادہ تخیل کے لئے گنجائش چھوڑی۔

ایک فلسفی نے کیا چبھتی ہوئی بات کہی کہ "دنیا میں جہاں کہیں حسین عورت ہے میری رشتہ دار ازلی ہے۔ یہ تعلق فرد انسانی میں ہمیشہ سے ہے اور وراثت طبعی کے قاعدے سے ہمیشہ رہے گا، ہماری تمہاری خاک سے اور اٹھیں گے اور یہ سلسلہ قائم رہے گا۔" وہ کہتا ہے "مجھ کو صرف ایک تخیل کی ضرورت ہے جو فانی زندگی کا ایک خیالی سہارا ہو اور اسی پر نہایت خوشی سے قانع رہوں گا کیوں کہ معلوم ہے دنیا دیکھنے کے لئے ہے برتنے کے لئے نہیں ہے۔"

اس قسم کے بہتیرے نکتے ہیں مگر دکھائے کون؟ آزاد جیتے جی مر گئے آپ باتوں باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔ کیا اچھا تھا اگر آپ "بیسویں صدی کا مناظرہ" لکھتے "اخوان الصفا" کے رنگ میں ایک خیالی مجمع الفصحاء (لٹریری اکیڈمی) ترتیب دیجئے، پورا دائرہ ہو، اراکین بحث یعنی اخلاقی، مذہبی، افادی، اقتصادی اور فلسفی وغیرہ مختلف الموضوع عناصر اگر جمع ہو گئے اور ان سبھوں میں آپس میں دماغی ٹکر ہوئی تو لطف آجائے گا۔ کچھ نہ سہی خیام کے فلسفہ پر ریویو کر ڈالئے اور جو پتے پتے کی کہہ گیا ہے، نا آشنایان حقیقت کو سمجھا دیجئے۔ بیچارہ یورپ کے ہاتھوں جی رہا ہے۔ ایشیا میں بے طرح اس کی مٹی خراب ہے۔ ثقہ لوگ اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے، نہ جاننا بھی ایک مزے کی بات ہے، اس قسم کی سرد مہریاں لٹریچر پر ایک بد نما داغ ہیں۔

آج کل سرمایہ دار وہی سمجھا جاتا ہے جو پچھلوں کے جمع کردہ مواد میں تصرف بیجا یا بجا کر سکے۔ آپ میں مادۂ اختراعی کی کمی نہیں، مواد موجود ہے۔ یورپ سے لیجئے اور خیالات کو پھیلا کر سمیٹیئے اور لکھئے۔ غزالی

اور ابن رشد[1] کا محاکمہ بہت دلچسپ تھا، لیکن ضرورت تھی کہ زیادہ پھیلاؤ ہوتا اور لگے لپٹے مسائل میں سے کچھ نہ رہ جاتا۔ مختصر یہ کہ جس پیمانہ پر آپ لکھ رہے ہیں، میرے توقعات اس سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں اور یہ امر آپ کی عظمت کے ثبوت میں ہے۔ نری باتوں سے خواہ وہ کتنی ہی پیاری ہوں اگر بار بار دہرائیے تو جی اکتا جاتا ہے۔ متعدد ادھورے مضامین کی جگہ ایک آدھ لکھیے لیکن ذرا دل لگا کر۔ کم سے کم ایک مضمون خالص فلسفیانہ رنگ میں ہو جسے جامعیت اور رکھ رکھاؤ کی حیثیت سے آپ اختراع فائقہ (ماسٹر پیس) کہہ سکیں۔

نئے گروہ سے کچھ امید نہ کیجئے۔ ان کے ہاں اس وقت تک صحیح علمی مذاق کا پتہ نہیں۔ نہ پڑھنا لکھنا ضروریات زندگی میں داخل ہے قومی لٹریچر سے بیگانگی جیسا اس سے پہلے کسی موقع پر لکھ چکا ہوں، ایک طرح کی نمود سمجھی جاتی ہے اور سچ یہ ہے کہ انگریزی شائد کچھ آتی بھی ہو۔ اردو تو خیر سے قطعاً نہیں آتی۔ انگریزی کی غیر ضروری آمیزش نے روزمرہ کا جس طرح خون کر رکھا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ کسی کو احساس نہیں۔ مغربی تمدن اور شائستگی کے دلدادہ جہاں یورپ کی تقلید پر مٹے ہوئے ہیں ایک خاص مسئلہ میں اجتہاد سے نہیں چوکتے، یعنی تکلفات زندگی کے اسراف کے ساتھ بھی قومی لٹریچر پر کچھ صرف کرنا جرم ہی نہیں بلکہ ایسا گناہ ہے جس کی باز پرس ہو کر رہے گی۔ ایسے افراد کہاں تک آپ کے توقعات پورے کر سکیں گے؟

بہر حال آپ سے جو کچھ ہو سکے کئے جائیے اور یہ تو میں تفصیل سے

---

[1] میر ناصر علی کے ایک مضمون کا نام جو ستمبر ۱۹۱۰ء کے صلائے عام، دہلی میں شائع ہوا تھا۔ مرتب

عرض کر چکا کہ آپ سے کیا چاہتا ہوں۔ مغربیت کے اثر سے نئے نئے عنوان زندگی پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں سے کسی بحث کو چھیڑیئے۔ آج کل عوائد رسمیہ (ایٹی کیٹ) اور ارتقائے لباس پر جو نہایت اہم مسائل ہیں کچھ لکھئے لکھائیے تو سب سے پہلے آپ کے دل و دماغ کے نتائج کی داد جس سے ملے گی وہ میں ہوں۔

فلسفۂ حسن و عشق

(یونانیوں کے نقطۂ خیال سے)

عورت کیا ہے؟ وہ دنیا میں کیوں آئی؟ اس کی ہستی کی علتِ غائی یعنی اس کا موضوع اصلی کیا ہے؟ یہ اور اس قسم کے بہتیرے سوالات ہیں جو ایک شائستہ دماغ کو متوجہ کر سکتے ہیں اور جن پر ہر زمانہ میں کچھ نہ کچھ غور ہوا ہے۔ لیکن ان سب کا مختصر مگر جامع جواب یہ ہے کہ "وہ محبت کی چیز ہے اور دنیا میں محض اسی لئے آئی"۔

محبت کیا ہے؟ ایک مقناطیسی کشش ہے! عورت بغیر چاہنے والے کے رہ نہیں سکتی۔ اس کی نزاکت فطری چاہتی ہے کہ کسی کا سہارا ہو، یعنی دو ایک ہو کر رہیں۔ جہاں یہ خود جان دینے کو تیار ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس پر بھی مرتا ہو۔ دنیا میں یہ صرف محبت کے لیے آئی اور گلے کا ہار بننے بنانے کے لئے پھولوں کی سیج پر اس کی بہار دیکھئے کہ تھوڑی دیر کے لئے افکار دنیا بھلا کر رہتی ہے۔

عالم خیال عورت کی وسیع دنیا ہے جہاں وہ اپنے جذبات کو فضائے بسیط میں چھوڑ دیتی ہے اور جو باتیں دراصل اس کو حاصل نہیں ہیں ان کا بھی لطف اٹھا لیتی ہے۔

اس کی ساری زندگی حسن و عشق کا فسانہ ہے وہ خود کسی پر مرتی ہوگی یا کوئی اس پر جان دیتا ہوگا! عورت پھنستی ذرا مشکل سے ہے، لیکن جہاں

پھنسی اس سے چھٹکارا پسند نہیں کرتی۔ اس کی اصلی غایت زندگی دوسرے کی پھانسی ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ جال ڈالنے سے پہلے وہ خود شکار ہو چکی ہے۔

عورت کتنی ہی پاکیزہ وش ہو، اس خیال سے خالی نہیں ہوتی کہ کوئی اس کی کافرادائی کا شیدائی ہو اس کی "فتوحات" اس کا سرمایۂ نشاط ہیں جن سے اس کے دل کو راحت ملتی ہے اور جن سے وہ جیتے جی کبھی دست بردار نہیں ہو سکتی۔ وہ وار کرکے رہے گی۔ کیوں کہ یہ امر اس کی فطرت میں داخل ہے شانہ سے آنچل خود نہ گرائے، لیکن اگر اتفاق سے گر جائے تو وہ دل میں خوش ہوگی۔ یہ اس کی فطرت کا راز ہے جسے وہی خوب سمجھتی ہے۔ دہرائے ہوئے آنچل میں دراصل اسے سینے کا اُبھار غائب کرنا منظور نہیں بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اور نظر جما کر دیکھئے! محرم کا جائزۂ نظری ایک طرح کی داد حسن ہے جو ہزار پارسائی کے ساتھ بھی وہ آپ سے لے کر رہے گی۔ اسی لئے جوانی کی آرائشوں میں دستانہ کی طرح چھبتی ہوئی چیز اسے دل سے پسند ہے۔ جس میں یہ ان "سرکشوں" کو قید رکھتا ہے۔ جنھیں عورت کے ارمان مجسم کہئے۔

"مئے دو آتشہ" وہ بھی، شباب کی، جب کھچ کھچا کر قدرتی کنٹروں میں بھری ہو تو کون ہے جو ان کیف مستی اور بیخودی کے "مجسموں" کی پرستش کا دلدادہ نہ ہوگا۔ ترکیب عناصر ہی تو ہے۔ ذرا "فطرت" کی شوخی دیکھئے گا! "فتنۂ قیامت زا" کے لئے گنجائش نکالی بھی تو کہاں؟

دنیا میں معیار حسن ہمیشہ مختلف رہا ہے اور آج بھی اختلاف مذاق کے لحاظ سے حسن کے لئے کوئی نصاب مشترک قائم نہ ہو سکا۔ تاہم ہر زمانہ میں عورت کا "مقیاس الشباب" دائرہ حسن کا مرکز عام رہا ہے۔ آج تک سننے میں نہیں آیا کہ اہل چین کی چپٹی ناک کی طرح "سپاٹ" سینہ بھی کہیں پسند طبائع ہو۔

موجودہ قصر جرمنی کو اپنی غیر معمولی شخصیت کے ساتھ بھی عورت کی "شہنشاہی" کے آگے جھکنا پڑا۔ آپ صنف نازک کے شائق ہیں لیکن اس کے

جو خوبصورت ہاتھوں کے ساتھ ابھرا ہوا اور قائم بالذات سینہ رکھتی ہو۔

اسی لئے حکماء بحر حسن کے اس زوردار تموّج" کو "بہترین عطیۂ فطرت" کہتے ہیں آپ نسائیت کا اصلی زیور کہئے اس میں کالی، گوری کی تخصیص نہیں۔ کوئی ہو کہیں ہو، صرف جوانی کے "آلہ حرب" سے اچھی طرح مسلح ہونے کی ضرورت ہے۔ پھر تو اس کی "فتوحات" کے لئے فضائے کائنات بھی کافی نہیں۔ دنیا اس کے قدموں کے نیچے ہو گی۔

عورت مرد کے مقابلہ میں زیادہ باکیف ہوتی ہے اور جن نزاکتوں کی طرف مرد کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا یہ ان کو سمجھتی بوجھتی اور قوت سے فعل میں لانا چاہتی ہے۔ جیتے جی کسی خوبصورت عورت کی پرستش کا موقع ملے تو سمجھئے خدا نے دنیا میں وہ چیز دی۔ جو بڑے بڑے زاہدوں کو سر رگڑنے کے بعد بھی نصیب نہیں۔ بہشت کا بھی وعدہ ہے! چاہنے والی عورت سے بڑھ کر جو پاکباز ہو، دنیا میں کوئی چیز نہیں، لیکن قابو میں لانے کے بعد یہ ایک سکنڈ کے لئے بھی چھوڑنے کے لائق نہیں

وہ انتہا درجہ کی حساس اور نازک مزاج بھی ہوتی ہے۔ دنیا میں اس سے کسی سے بیر ہے تو چاہنے والے سے۔ دوپٹہ میلا ہے تو سمجھ لیجئے چاہنے والے کا قصور ہے۔ عورت کہتی یہی ہے کہ انھیں کو پرواہ نہیں تو بدلیں کس کے لئے۔ وہ خوش ہیں تو بات بات میں بانکپن دیکھ لیجئے۔ کنگھی چوٹی کا درد سر اسی وقت بھلا معلوم ہوتا ہے جب دل سے دل ملا ہو اور اس کی مانگ ہو! عورت کے بناؤ سنگھار یعنی آرائش کی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے دل کی حالت کی غماز ہوتی ہیں۔ کسی نے آنکھ بدلی اور یہاں صورت بگڑی، وہاں دلداری ہے تو ادھر بھی دل آرائی دیکھ لیجئے۔ محرم کے بند اگر کھنچ کر بندھے ہوں تو سمجھ لیجئے "زد" پر کوئی ہے جس کے لئے یہ سینے کو "دہرے پایہ" پر رکھنا چاہتی ہے!

حسین عورت کے لئے کم سنی لازمی نہیں کہ چڑھتی دوپہر سے ڈھلتی چھاؤں

زیادہ خوشگوار ہوتی ہے۔ فلسفۂ حسن و عشق کا یہ نہایت باریک نکتہ ہے جو لائق غور ہے۔ عورت وہی باکیف ہوگی جو لذت آشنا ہو اور جس میں لذت احساس کامل ہو۔ یہ عالم فطرت کی نیرنگیاں ہیں، شراب کی طرح کہ جتنی پرانی ہو مزیدار ہوتی ہے۔ عورت کی عمر کا وہ حصہ جو تیز روشنی کی جگہ تاروں کی چھاؤں یا پچھلے پہر کی چاندنی سے مشابہ ہے۔ جان دے دینے کے لائق ہوتا ہے۔ ۲۵-۲۶ برس کی حسین عورت جو صورت کے ساتھ حسن سیرت بھی رکھتی ہو اور جس میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہو، انسانی تخیل کا بہترین مرقع ہے۔

عورت باعتبار جذبات، ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس کی ساخت میں نہایت نازک پھول پتیاں صرف ہوئی ہوں۔ جس طرح پھول کی پتیوں میں نازک رگیں نسیں اور باریک نقش و نگار ہوتے ہیں، عورت کا دل و دماغ بھی ہر طرح کی لطافتوں اور نزاکتوں کا مخزن ہوتا ہے، جس کے بیل بوٹے قدرت کی بہترین نقاشی ہیں۔ ان ہی باریک حسیات اور جذبات کا ابھارنا اور ان کے نشو و ارتقا و تدریجی کے سلسلہ کو قائم رکھنا چاہنے والے کا اصلی فرض ہے۔

عورت ہماری زندگی کے ہر صیغہ کو مس کرنا چاہتی ہے وہ ہماری عقلی اور اخلاقی قوتوں کو حرکت میں لاتی ہے، لیکن ایک شائستہ عورت پر وہی قابو حاصل کر سکتا ہے۔ جس میں عورت کے فطری اوصاف کے مقابلے کی قابلیت موجود ہے جس کے قوی تر جذبات عورت کی قدرتی نزاکتوں اور لطافتوں سے ہم آغوش ہو سکیں۔

اس کے خیال میں صرف آرزوئے "وصل" جس پر ہمارے شعراء سر دھنتے ہیں، نری حیوانیت ہے۔ وہ "خوش عیشی" کے مقابلہ میں "فلسفۂ ناکامی" میں کہیں زیادہ لذت پاتی ہے جو اس کے نازک سے نازک جذبات اور حسیات کو تحریک میں لائے۔ عورت کی ایک آہ جو دل سے نکلی ہو، ہزار صوفیانہ ریاض و اعمال پر بھاری ہے جس میں شائبہ خلوص نہ ہو!

یہ دنیا میں فطرت کی تکمیل کے لئے آئی اور اسی لئے مہذب دنیا میں اسے انسان کا "نصف بہتر حصہ" کہتے ہیں۔ محبت، دلسوزی، خلوص و ہمدردی اس کا خاصۂ فطری ہے یہ جہاں ہماری خوش دلی کو بڑھاتی ہے رنج و غم کو بانٹ لیتی ہے، صحت میں یہ رفیق زندگی علالت میں خوش سلیقہ دایہ اور موت کے بعد ہماری خوبصورت سوگوار ہے، جس کی ہیرا تراش کلائی میں پھنسی ہوئی سیاہ چوڑیاں اور کھلے ہوئے لمبے بال وہ علامات ماتم ہیں جنھیں جیتے جی دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔

آہ عورت! تو فسانۂ زندگی ہے، تو جس طرح ایک جھونپڑے کو اپنی صاف شفاف ہستی سے شیش محل بنا سکتی ہے، بڑے سے بڑے ایوان عیش کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تیری موجودگی کے آثار اس میں نہ پائے جائیں۔

اس کے لئے چھ "وں" کی جھنکار ضروری نہیں، محض تیرا پس پردہ ہونا کہیں ہو کسی کے لئے ہو، کافی ہے۔ شیکسپیر نے سچ کہا ہے کہ "تو مجسم عشوہ گری ہے اور دنیا میں بے فوج کی سلطنت تیرا اور صرف تیرا حصہ ہے"۔

یہاں تک تو حسن اور اس کے لطیف متعلقات پر شاعرانہ نکتہ سنجیاں تھیں، لیکن مجھے دیکھنا ہے کہ عشق کیا چیز ہے۔ حکماء کی رائے کے مطابق یہ ایک جوہر وجدانی ہے، انسانی اجسام، انسانی حافظے، انسانی خواہشات فنا ہو جائیں گی لیکن یہ جوہر غیر فانی یعنی عشق ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔

"تصوف" صرف مذہب عشق ہے۔ آپ فرط سنجیدگی سے "حقیقت" کے پیچھے پڑے اور جیسے آئے تھے ستر، اسی برس کے ریاضات اور مجاہدات کے بعد بھی کورے گئے! میں نے آنکھ کھولی تو کچھ نہ دیکھ سکا، اس لئے آپ کی اصطلاح میں صرف "عشق مجازی" سے غرض رکھی، یعنی اپنا "معبود" خود پیدا کر لیا اور تھوڑی سی عمر جو لے کر آیا تھا اس خیال میں گذار دی۔

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

گوشوارہ پر آپ دیکھیں گے، میرا پاکیزہ تخیل بڑے بڑے زاہدوں کے "صعوبات لاطائل" سے کتنا اچھا رہا، وہ عمر بھر روتے رہے اور روتے گئے اور میں نے ہنستے کھیلتے دن کاٹ دیئے۔

یہ فقرہ معترضہ تھا۔ اہل سائنس کا خیال ہے کہ عشق چاہنے والوں میں سے کسی کا اختیاری نہیں بلکہ ایک جذبۂ اضطراری ہے جو گذشتہ زمانے کے ہزار میلان طبائع نے وراثتہً ہمارے لیے چھوڑا ہے، ہم کسی عورت کو اس لیے نہیں چاہتے کہ وہ نازنین ہے، پری پیکر ہے، خوش ادائی اور دلفریبی میں آپ اپنی نظیر ہے، بلکہ وہ ہمارے دائرہ پرستش کا مرکز اس لیے بنی ہوئی ہے کہ وہ ایک ناقابل بیان طریقہ سے جنسی مقابل یعنی مرد کے لیے ایک ایسا "نغمۂ مستانہ" چھیڑتی ہے جسے مرد ہی خوب سمجھتا ہے اور جو ہماری زندگی کے جوہر خالص یعنی روح کو ان طبقات بالا تک پہونچاتا ہے جہاں خیال کے سوا کسی چیز کی رسائی نہیں۔ یہ بحث نہایت دلچسپ ہے لیکن مستقلاً اظہار خیال چاہتی ہے، یہاں اس کے چھیڑنے کی گنجائش نہیں، پھر کبھی دیکھئے گا، سردست ایک مغربی شاعر کے خیالات سنئے جو جذبات میں ڈوبا ہوا ہے اور اپنی معشوقہ یعنی اپنی بیوی کے فراق میں یوں اظہار خیال کر رہا ہے۔

"رات کا پچھلا پہر اور دل ہی دل میں کچھ باتیں" میری ہستی بے ثبات کا سب سے بڑا کارنامہ تیری محبت پر قابو حاصل کرنا تھا، میں نہ ہوتا تو تو یقیناً غیر مفتوح رہتی، یعنی کسی کے بس میں آنے والی نہیں تھی۔ کیا دنیا کی کوئی قوت جیتے جی تجھ کو مجھ سے چھڑا سکتی ہے؟ پھر یہ علیحدگی کیسی؟ دیوانگی، استغراق، فنا، مذہب عشق کی صرف اصطلاحات ہیں۔ میں تجھ میں اس طرح تحلیل ہو گیا ہوں کہ وجود ذاتی کا سرے سے پتہ نہیں، آخر کیوں؟ کیا تیرا دلفریب حسن، تیری کافرادائیاں اس کا باعث ہیں؟ نہیں! تو عشق مجسم ہے، تو مستی شباب کے سوا جذبات میں اس

طرح ڈوبی ہوئی ہے کہ تیری غایت زندگی صرف محبت ہے اور کچھ نہیں!

ہاں تو نے عشق کی کاٹ عشق سے کی اور میں مقابلہ میں ٹھہر نہ سکا۔ یعنی بازی ہاری۔ ہائے کتنی دلچسپ فتح ہے! لیکن آخر مجھے اپنی شکست پر ناز کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ "شکست" دنیا کے اور دیوانوں کے حصّے میں کبھی نہیں آئی۔ آرزوئیں اور قصّے ہی رہے۔ مطلوب کا ملنا دوسری دنیا کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ یہ خیال کہ تو مجھے چاہتی ہے۔ جان دے دینے کے لئے کافی ہے۔

تجھ کو پاکر چاہیئے تھا کہ بیقراری کچھ کم ہوتی۔ لیکن یہ کیسا روگ ہے جو کسی طرح چین نہیں دیتا، میں دیکھتا ہوں کسی طرح چین نہیں۔ خاص کر آج کل کی جدائی بلائے جان ہو رہی ہے۔

عرب کی جوشیلی عورت اپنے عاشق سے جدا رہنا پسند نہیں کرتی۔ یعنی وہ فطرتاً ہم آغوشی و ہم بستری کی شائق ہوتی ہے۔ میری پیاری! کیا تو کم پرجوش ہے؟ تیری تو رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بجلی بھری ہے، یہ تیری دبی ہوئی چنگاریاں تھیں جن سے میری زندگی کی بجھی ہوئی حرارت دفعتاً بھڑک اٹھی۔

پیاسے کو انگاروں پر لٹانا جب چند قطروں سے پیاس بجھتی ہو! یہی شرطِ وفا ہے؟ تو نے کیوں مجھے وہ گر سکھائے جن سے آج تک ناآشنا رہا! تو نے میری ایک سوئی ہوئی قوت کو جو حاسۂ انسانی میں سب سے زیادہ لطیف و شیریں ہے، چھینٹے دے دے کر جگایا۔ تیری تطبیق اعضائی اور انگوٹھی پر نگ کی سی موزونیت تیری نفاست اور پاکیزگی فطرت کا ایک راز ہے! سچ یہ ہے کہ تو یونانیوں کی محض "زہرۂ عریاں" نہیں بلکہ حسن و عشق کی مشترک دیوی ہے۔

جوانانہ خوش فعلیاں ان دنوں خواب و خیال ہو رہی ہیں، جب سے تو چھوٹی زندگی وہ نہیں رہی!

میری خاک ایک دن خاک ہو کر رہے گی، لیکن وہ جوہر غیر فانی یعنی تیرا عشق میری یاد دلاتا رہے گا، لیکن قبل اس کے کہ یہ صورت پیش آئے، آکر

مجھے گلے لگائے۔ زندگی تو آج کا نام ہے، کل اختیاری نہیں۔ تیرے ساتھ کے چند گھنٹے ہزار زندگیوں کے برابر ہیں۔ دیکھ! میری عمر کا بڑھانا تیرے لئے کتنا آسان ہے۔ کیسی مجبوری اور کہاں کا رکھ رکھاؤ! جس کوچہ میں تو نے قدم رکھا ہے وہاں تیرے کا گذر نہیں۔ ان ڈھکوسلوں سے کیا واسطہ؟ عشق کا فتویٰ تو یہ ہے کہ دو کے سوا تمام دنیا حرف غلط۔"

ملک میں تاریخ کا معلم اول

یورپ کے علمی قلم رو میں ایک زندہ دل طبقہ ایسا بھی ہے جو انسان کی دماغی پیداوار یعنی کتابوں کو "علمی حرم" کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور ان کا دلدادہ ہے۔ اس کے خیال میں کسی کتب خانہ کا ایک گوشہ جہاں اس کی منظور نظر "نازنینوں" کا جھرمٹ ہو اور جو ہمیشہ اس کی فرصت اور مرضی کی منتظر رہتی ہوں، اس شاہی محل سے کہیں بڑھ کر ہے جس کے لوازم عیش صرف دور سے دیکھنے کی چیز ہیں۔ بہر حال ایک ایسا گروہ موجود ہے جو علمی دنیا میں درجۂ استغراق رکھتا ہے اور زمانہ کے سرد و گرم سے قطعاً بے پروا ہے اس کا دائرۂ مخصوص خود ایک دنیا ہے جہاں ایسے سامانوں کی کمی نہیں، جن سے قوت احساس ہر طرح کی لذت و انبساط حاصل کرتی رہتی ہے۔ اسی حلقہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی نفاست اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ معمولی مطبوعات کو پسند نہیں کرتے۔ خاص خاص تصنیفات کے قیمتی اڈیشن شائع کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اس قسم کے معزز شواہد بہ مشکل پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن طبقۂ اعلیٰ کے مصنفین میں علامہ شبلی کی تصنیفات کو یہ امتیاز حاصل ہے جو حسن سیرت کے ساتھ صورت کی بھی اچھی ہوتی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ لفافہ

اچھا ہو تو ملفوف کو اس سے کہیں زیادہ اچھا ہونا چاہیئے۔

علامہ شبلی اپنے موضوع سخن اور اس لحاظ سے کہ انھوں نے اپنے ملکۂ راسخہ یعنی فطری قوت تصنیف سے وہی کام لیا جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا مصرف ہو سکتا تھا۔ ملک کے مصنفین میں یہ سرفہرست تو تھے ہی، میں دیکھتا ہوں اب بہت آگے نکلے جاتے ہیں۔ انھوں نے فلسفۂ تاریخ کو صرف اس لحاظ سے کہ وقت کی چیز ہے اپنا خاص فن قرار دیا اور ترتیباً جس پیمانہ پر یہ اظہار خیال کرتے رہے وہ ایک منحرف بھی تسلیم کرے گا کہ ان کی قوتوں کا صحیح سے صحیح استعمال تھا، جو خیال میں آسکتا ہے۔ ملک میں اچھے لکھنے والوں میں "قوت فیصلہ" کی ہمیشہ کمی رہی یعنی دماغوں میں اقتضائے وقت کی رعایت نہیں۔ وقت ہی آگے چل کر بتائے گا کہ ان کے نتائج فکر ایک طرح کی خودرو پیداوار ہیں، جن کی شادابی صرف ایک موسمی چیز ہے۔ لیکن علامہ شبلی سے ہم کو اس قسم کی شکایت نہیں، یہ بلا بار تہدید و فرمایش جو کچھ کرتے رہتے ہیں وہ ہمارے توقعات اور استحقاق سے کہیں زیادہ ہے۔ حالتوں کا موازنہ آج کل کے عوائد رسمیہ (یعنی اٹیٹی کیٹ) کو دیکھے لائق شائستگی سمجھا جاتا ہے۔ تاہم یہ تنقید کا ایک ضروری عنصر ہے، لیکن میں اس وقت ان کو ان کے دائرے کے دوسرے خلاقین سخن سے ٹکرانا نہیں چاہتا، صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس طرح یہ اپنے حلقہ میں غالباً سب سے کم عمر مصنف ہیں، ادبی حیثیت سے نسبتہً اتنے ہی بڑھے ہوئے ہیں، اس دماغی فوقیت کا راز صرف یہ ہے کہ خوش نصیب شبلی نے اپنی وہبی اور اکتسابی قوتوں کی رعایت سے جو وسیع موضوع بحث اختیار کیا وہ بلا استثنا اوروں کی دسترس سے باہر تھا۔ اس سے زیادہ موزونیت لائق رشک ہے جو قواماً ان کے ہر حصۂ تصنیف کا ایک خاصہ ہوتی ہے اسلامی تاریخ و لٹریچر فلسفہ و عقائد سے متعلق جس قدر مواد یہ یکجا کر سکے، قدیم تاریخ کا گویا نچوڑ ہے۔

تاریخ اسلامی کی نسبت ایک زمانہ میں یورپ نے جس قدر متعصبانہ رائے

قایم کی تھی، اب رفتہ رفتہ ان سے دست بردار ہوتا جاتا ہے، موجودہ دور میں جو ہر قسم کی دماغی ترقیات کا دور ہے۔ واقعات کا ایک معیار صداقت قائم ہو گیا ہے۔ ہر واقعہ کی جانچ اجتماعی، اخلاقی اور فلسفیانہ حیثیت سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ علمائے مستشرقین کی توجہ سے جدید سلسلۂ اکتشافات میں ایک نیا لٹریچر پیدا ہو گیا ہے، جس میں ہمدردانہ التفات کے ساتھ ایک طرح کی سنجیدگی اور بلند نظری پائی جاتی ہے۔ لیکن باوصف اس حسن ظن کے جو جماعت مستشرقین کی طرف سے پیدا ہو چلا ہے۔ ان[1] کے خیالات کا بیشتر حصہ نظر ثانی چاہتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں کم نہیں ہیں جن میں مغربی علماء کی اجتہادی لغزشیں اب بھی محسوس ہوتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ استخراج نتائج میں عمداً بے پروائی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن علامۂ شبلی نے ہم کو غیروں سے قریب قریب بے نیاز کر دیا ہے۔ یہ جس طرح قدیم تاریخ اور لٹریچر کے جامع ہیں، آج کل کے فلسفیانہ انتقادات اور نکتہ سنجیوں سے آشنا ہی نہیں بلکہ یہ مذاق ان میں اس قدر رچا ہوا ہے کہ ان کے طے کردہ مسائل جو دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں، اس حد تک کامل ہیں کہ زمانۂ آئندہ بلکہ "بعید آئندہ" میں بھی ان پر کوئی معتد بہ اضافہ نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح ان کے اجتہادات کا جن کو تاریخی "الہامات" کہئے، بیشتر حصہ میرا خیال ہے مدتوں متروک ہونے کے لائق نہیں ہو گا۔ اس سے زیادہ شبلی کے غیر فانی ہونے کا ثبوت کیا ہو گا۔

اگر موجودہ نسل کے لئے دماغی اور عقلی ترقی کے ساتھ اخلاقی تکمیل کی بھی ضرورت ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ شبلی نے تاریخی سلسلہ میں جس قدر مذہبی

---

[1] دیکھئے یورپ کے سرخیل وان کریمر کی تصنیف مختص الموضوع جس میں دکھایا گیا ہے۔ کہ اسلام اپنی ترکیب و ساخت کے لئے مذاہب ماسبق کا ممنون ہی نہیں بلکہ ادیان سابقہ کی صرف ایک ارتقائی صورت ہے۔" مہدی

لٹریچر پیدا کر دیا ہے وہ ہمارے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ خاص کر اس جدت کے لحاظ سے کہ فاضل شبلی نے ایک طرف تو "بڑے میاں" یعنی مذہب کی پگڑی نہیں اُتاری اور ساتھ ہی یورپ کے نوخیز چلتے پرزوں یعنی فلسفہ اور سائنس کے سامنے تیرہ سو برس کے بوڑھے سے ہاتھ نہیں جڑوائے بلکہ دونوں میں مصافحہ کرا دیا۔ یہ معتدل روش جو اس "ادبی نزاع" میں اختیار کی گئی ہے لائق رشک شبلی ہی کا حصہ تھا جو ہمارے متفق علیہ پیشوائے علمی ہیں۔ ان کی ثقاہت نے جہاں مذہب کی حق تلفی نہیں ہونے دی، سائنس و فلسفہ کی مغائرت بھی دور کر دی اور ان کو مذہب کا دست و بازو بنا دیا۔ آئندہ زمانہ میں جب ہماری عقلی ترقیات کا شباب ہوگا شبلی کو اپنی مساعی جمیلہ کی پوری داد ملے گی تاہم آج کل کا تعلیم یافتہ طبقہ جو عموماً مذہب سے بے پروا ہے مذہب فطری یعنی حکیمانہ اسلام سے دست بردار نہ ہو سکے گا منقول کی تطبیق کی غایت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے جو شبلی کی دردسری کا بجائے خود ایک قیمتی صلہ ہے۔

ملک کے روشن خیال طبقہ میں کہیں کہیں ایک طرح کے حکیمانہ "تذبذب فی المذہب" (یعنی ایگناسٹک خیالات) کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس لئے شبلی کی "تنقیدات عالیہ" (ہائر کریٹی سزم) کو وہ حمایت مذہب میں چنداں وقیع نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کوئی نئی اُپج نہیں ہے۔ شبلی سے اگر غلطی ہوئی تو صرف اس قدر کہ انھوں نے مذہب کو آج کل کی عقلیات سے ٹکرایا۔ یہ غلطی اس سے پہلے بھی جب مسلمانوں کے دن اچھے تھے، ہو چکی ہے۔ اور علم کلام کو عباسی دور کی دماغی ترقیات کے لحاظ سے "یادِ ایام" سمجھئے جو عقائد اسلام اور فلسفۂ قدیم کے گزشتہ اختلاط کی ادبی تاریخ ہے۔ لیکن اس زمانہ میں اسلام کو صرف فلسفہ یعنی ایک حد تک محض اصول نظری سے سابقہ تھا۔ اس لئے جس طرح لحاف کی تیاری میں کچھ استر سے لیا، کچھ ابرے سے اور دونوں کا جھول جھال لے کر برابر کر دیا۔ دونوں حریف جو چھری کٹاری ہو رہے تھے، گلے ملوا دیئے لیکن آج مذہب کو اپنے دشمن ازلی یعنی سائنس کا مقابلہ کرنا ہے جو قوی تر حریف ہے

(اور) جو اپنے سوا دنیا میں کسی کو دیکھنا نہیں چاہتا۔

مذہب کے اولیات کا انحصار کلیۃً امور غیر مادی یعنی ایسی چیزوں پر ہے جو مدرکات انسانی سے باہر ہیں یعنی ہمارے حواس فطری ان کے سمجھنے بوجھنے سے عاری ہیں اور سائنس صرف مادیت سے غرض نہیں رکھتا بلکہ اس کا دعویٰ ہے کہ "عالم غیر" کا خیر سے وجود ہی نہیں ہے جس پر ہم آپ اس قدر مٹے ہوئے ہیں! بہر حال فلسفہ پھر بھی اتنا برا نہیں ہے "سنی سنائی" کبھی کبھی مان لیتا ہے لیکن سائنس اتنا کٹر ہے کہ جب تک "آنکھوں دیکھی" نہ ہو، ہزار کہئے، کتنے ہی بڑے بڑے جبہ و دستار پیش کیجئے، مذہب کی دہائی دیجئے، ایک نہیں سنتا۔ ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کافر، خود غلط! کسی "شریعت سہلۃ" کی گرفت میں کہاں تک آ سکتا ہے۔ لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم مذاہب سے عموماً دست بردار ہو جائیں؟ اس کا فیصلہ میں انسان کی اگلی پچھلی اخلاقی تاریخ پر چھوڑتا ہوں جس کی تکمیل کی نسبت خود فلسفہ کا یہ دعویٰ ہے کہ بغیر مذہب کے ہو ہی نہیں سکتی۔ شبلی نے الکلام میں نفس موضوع کے لحاظ سے جس پیمانہ پر اظہار خیال کیا، اس کے سوا چارۂ کار ہی کیا تھا۔ آپ کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہیں تو پہلے ضرورت ہے کہ بڑے میاں سے آپ کو حسن ظن بھی ہو۔ یہ نہیں کہ ایکدم سے پگڑی اتار لی اور دعویٰ یہ کہ ہم آپ کے سچے عقیدت کیش ہیں۔ فرطِ خلوص سے لگی لپٹی نہیں رکھتے۔

طبائع انسانی کے لئے اگر مذہب کی ضرورت ہے تو اس کے مسلمات اعتقاداً جسے ایک طرح کی مجبوری کہئے، تسلیم کرنے ہوں گے۔ رہی معقول و منقول کی تطبیق، جہاں تک مذہب میں استطاعت ہے، آپ دونوں کو ٹکرا سکتے ہیں علم کلام کا اتنا ہی فرض ہے۔ شبلی حکیمانہ خیالات کے ساتھ گہرا مذاق مذہبی رکھتے ہیں، اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ حکمائے اسلام کی طرح "متکلمانہ" لکھا ہے۔ اس پر بھی لکھنؤ کے ایک مشہور انشا پرداز فاضل عصر کی مذہبی تحریرات سے

عام سوظن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت کو "اعتزال" کی فکر ہے جس میں پھر بھی ایک مذہبی رنگ ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس زمانہ میں جو سائنس کے اکتشافات عالیہ کا دور ہے، سرے سے مذہب کی جان ہی کے لالے ہیں اور آج کسی مذہب آسمانی میں اتنی قوت نہیں کہ منحرف سائنس کو زیر کر سکے۔

میں رَو میں سلسلہ سے کسی قدر دور جا پڑا، کہنا یہ تھا کہ اردو لٹریچر کے پیدا کرنے والے تھوڑے ہیں۔ ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آج کل کے معیار قابلیت کے لحاظ سے اہل قلم کی صف اول میں شامل ہونے کے لائق ہوں۔ شبلی[1] بہ لحاظ فن میرا خیال ہے صرف ہندوستان نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں ہیں۔ اس کو میری قاصر النظری پر نہ محمول کیجئے۔ فلسفہ، تاریخ جو آج کل تمام علوم میں سرفہرست ہے، ایک مستقل فن ہو گیا ہے اور اس قدر اہم ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاضل مورخانہ موشگافیوں کو بہترین مشغلۂ ہستی سمجھتے ہیں۔ مصری اور ترکی لٹریچر میں تاریخی مذاق جس قدر موجود ہے ہم اس سے ناواقف نہیں ہیں لیکن جن مضامین پر وہاں سرگرمی سے طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں وہ شبلی کے ہاں فرسودہ اور مسائل ابتدائی ہیں جن کو فاضل مورخ کی سرسری جنبش قلم مدت ہوئی ایک سے زیادہ موقع پر طے کر چکی ہے۔ سچ یہ ہے کہ شبلی بہ لحاظ جامعیت اور وسیع النظری اور نیز مورخانہ تدقیق اور اکمال فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے سے بڑے مورخ سے پہلو بہ پہلو ہو سکتے ہیں۔ یورپ کو شکایت ہے کہ مسلمانوں میں متقدمین بلکہ متاخرین میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ہوا جسے صحیح معنوں میں اگر حفظ روایات سے قطع نظر کی جائے

---

[1] یہاں میری غرض تاریخی لٹریچر سے ہے ورنہ ادب اور معقولات پر سرسید کی قلمی فتوحات دراصل ان کی ادبیات میں محسوب ہونے کے لائق ہیں۔ جن سے ملک میں کوئی اہل قلم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مہدی

تو "تورخ" کہنا درست ہو یعنی استقصائے روایات کے سلسلہ میں جہاں اصلی ماخذوں کی چھان بین کی گئی غیر مرتب مواد سے کسی دور میں ایسے نتائج حاصل نہیں کیے گئے جن میں طبیعت انسانی کے اقتضا، زمانہ کے ماحول اور خصائصِ طبعی یا قرائنِ عقلی سے مدد لی گئی ہو۔

ابن خلدون کا نام بار بار لیا جاتا ہے جس نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا مگر خود اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے خیالات قوت سے فعل میں نہ آسکے۔ یہ بالکل صحیح ہے لیکن آج ہم بیسویں صدی کے ایک فاضل مورخ کو پیش کرتے ہیں جس کا دائرۂ معلومات اس قدر وسیع ہے کہ وہ اپنے سلسلۂ تحقیقات کی فروگذاشت کی تلافی کرتا جاتا ہے اور اگر وقت نے مہلت دی اور اس کا تخیل پورا ہو سکا تو تاریخ اسلامی کے مہمات مسائل ایک ایک کر کے طے کر دیئے جائیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے گوشوں میں بہتیرے علما پڑے ہیں، ممکن ہے، لیکن کسی شخص کا دماغ دوسروں کے علوم و فنون سے بھرا ہو اور خود اس میں تحقیق و اختراع کا مادہ نہ ہو تو ایک بیکار سی چیز ہے۔ اس لئے ایک فلسفی کے خیال کے مطابق اصلی قابلیت صرف وہ وسائل یعنی طریقۂ استعمال ہے جس سے مواد گزشتہ کارآمد بنایا جا سکے۔ یہی تصرفات ہیں جن کی بنا پر ایک ادیب یا مورخ کو لایق سے لایق شخص پر جو صرف "جامع اللغات" ہو ترجیح فائقہ حاصل ہے ورنہ ظاہر ہے کہ نرے الفاظ مؤخر الذکر کے ہاں کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔

انسانی احساسات و خیالات، تحقیقات و اختراعات کی مسلسل تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے اور کارلائل کہتا ہے کہ جس شخص کو "چھپے ہوئے حرفوں" کا راز معلوم ہے وہ انھیں قوت آخذہ سے اپنا کر سکتا ہے۔ صرف صدائے اصلی کی تلاش کا ذوق صحیح ہونا چاہیئے۔ ہاں شبلی، فاضل شبلی "نقوش حرفی" کے رازدار ہیں، انھوں نے اپنے ماخذوں کی چھان بین میں صرف صدائے اصلی سے غرض رکھی

اور اپنے وسیع سلسلۂ تحقیقات میں زبردست قوت استقرائی کے ساتھ اسباب و نتائج کی تفریحات فلسفیانہ سے آج کل کے ترقی یافتہ مذاق کے مطابق اس طرح کام لے سکے جس سے ان کی آواز بازگشت تمام ملک میں گونج اٹھی اور ہندوستان کے ادبی قلم رو میں ایک نیا تاریخی دور شروع ہو گیا۔

مختصر یہ کہ آج کل کے مصنفین میں علامہ شبلی کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے جو ان کے اور ہم عصروں کے حصہ میں نہیں آیا، ان کے سخت سے سخت حریف مقابل بھی ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہونچتے۔

نہ جاننا بھی مزے کی بات ہے۔ اس لئے بعضوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی، لیکن ہندوستان کیا اور ممالک میں بھی دو چار سے زیادہ نہیں ہیں جو مذاق موجودہ کے مطابق مسائل قدیمہ کے طے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں شبلی ہم میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ و فلسفہ میں ربط باہمی پیدا کیا اور ان جواہر عقلی کی تحلیل و ترکیب اس طرح کر سکے کہ لٹریچر میں ایک خاص امتزاج پیدا ہو گیا ہے جس کے آثار ان کے مستقل سرمایۂ تصنیفات کے سوا ان کے متفرق مضامین میں بھی ملتے ہیں، جو مدتوں ان کے قلم کے سایہ میں مسلسل طور پر وقف عام ہوتے رہے۔

اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ

آئندہ زمانہ میں اردو لٹریچر کی اگر تاریخ لکھی گئی تو انیسویں صدی کا پچھلا دور اس عہد کا "نشاۃ الثانیہ" (یعنی دور جدید) ہوگا جس میں ایک بازاری زبان جس کا سرمایۂ ناز ایک بے غایت شاعری کا مجموعۂ خود در تھا، منازل ارتقائی طے کرتی ہوئی اس سطح امتیازیہ کے قریب قریب پہنچ گئی جہاں دنیا کی اعلیٰ ترزبانیں اپنا سکہ جما رہی ہیں۔

کل کی بات ہے جب تُک سے تُک ملا لینا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ گرمی محفل کے لیے چند مصرعوں کی پیوند کاریاں لٹریچر کے فرائض سے ہم کو سبکدوش کر دیتی تھیں لیکن اقتضائے وقت کے ساتھ تغیر مذاق دیکھئے کہ آج ہم کو ان کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔

یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کائنات میں کوئی چیز نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو۔ ہمارے جذبات بدلے، خیالات بدلے، تغیر حالت کے ساتھ وہ آثار خارجی بھی جن میں ہم گھرے ہوئے تھے، کچھ سے کچھ ہو گئے۔ غرض زمین بدلی آسمان بدلا اور ہم بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے اور ابھی معلوم نہیں موثرات خارجی اور واقعات کی قدرتی رو ہم کو کہاں سے کہاں لے جائے گی!

اس کش مکش اور سلسلۂ انقلابات میں اتنا ہوش کہاں کہ طبقات ارتقائی

کی درمیانی کڑیاں آپ کو گنائی جائیں۔ صرف یہ سمجھ لیجئے کہ بوسیدہ اور فانی اجزا کی جگہ قوی تر عناصر نے لے لی اور اقلیم سخن کی شریف تر ہستیاں عالم وجود میں آئیں جن سے اردو سا کم سواد لٹریچر ایک دم سے آشنائے فلسفۂ ادب ہو گیا۔

میری غرض لائق عزت سرسید، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی سے ہے جن کے قلم کے سایہ میں اردو یعنی کل کی چھوکری اتنی رودار ہو گئی کہ السنۂ یوروپ یعنی مغربی سے بے تکلف آنکھیں ملا سکتی ہے، ان میں سے ہر شخص مختص النوع خصائص ادبی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کا آپ مالک ہے اور جس طرح ادب القدما (یعنی کلاسیکس) آج واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے ایک وقت آئے گا جب ان کے ادبیات کا بیشتر حصہ لائق پرستش اور غیر فانی سمجھا جائے گا۔

یہ موضوع نہایت اہم ہے اور چونکہ بہت پھیلایا جا سکتا ہے اس لئے سرسری طور پر ٹالنا منظور نہیں، بلکہ میری خواہش ہے کہ آج کل کے اچھے لکھنے والے اس پر قلم آزمائی کریں، میری غرض لائق نگاری سے نہیں ہے بلکہ صرف تنقید ادبی (یعنی لٹریری ریویو) چاہتا ہوں، جس میں بہ لحاظ فن فرداً فرداً ہر مصنف کے نتائج فکر کی خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ ایک حد تک تنقیدات عالیہ (یعنی ہائر کریٹی سزم) کا حق ادا ہو جائے۔

سرسید نے ادب اور معقولات پر جس حد تک مجتہدانہ رنگ چڑھایا دراصل ان کی اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ یہ انھیں کے قلم کی آواز بازگشت ہے جو ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کے لئے دلیل راہ بنی آج جو خیالات بڑی آب و تاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف لباس میں جلوہ گر کئے جاتے ہیں، دراصل اسی زبردست اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں۔ ورنہ پہلے یہ جنس گراں باوصف استطاعت اچھے اچھوں کے

دسترس سے باہر تھی۔ سرسید کے کمالات ادبی کا عدم اعتراف صرف ناشکری نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہے اور میں خوش ہوں کہ شریف النفس حالی نے آج کل کی بہتر سے بہتر "سوانح عمری" لکھ کر منحرف طبائع کو بہ وساطت سخت سے سخت شکست دی جو خیال میں آسکتی ہے۔ لیکن نئی نسل پچھلا سبق کسی قدر بھول چکی ہے حالانکہ سرسید کے حقوق زیادہ تر اسی کی گردن پر ہیں بلکہ مجھے کہنا چاہیئے کہ لٹریچر کے حقوق کا اقتضا یہ ہے کہ سرسید کے علمی کارنامے پر نگاہ عکس ریز ڈالی جائے اور اس کے لئے سید سجاد حیدر (یلدرم) مجھے زیادہ تر موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

علامہ نذیر احمد کو میں "ثم المارہروی" تو بہ اسید افتخار عالم کے سر لگانا چاہتا ہوں جنھوں نے حال میں مولانا کی نہایت مفصل سوانح عمری شائع کی ہے بالاستحقاق ان سے بہتر کوئی شخص خیال میں نہیں آتا۔ یہ لکھیں گے اور ہم دردانہ اور سخن گسترانہ لکھیں گے۔ اسی کی ضرورت ہے۔ نذیر احمد کو ایک حد تک عقلیات سے رسیاں تڑاتے رہے لیکن ادب اور "منقولات" سے متعلق جو دفتر انھوں نے چھوڑا ہے۔ وہ اس قدر اہم ہے کہ کچھ سرسری ریمارک کرنا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔ ان کی اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ بے مثل قدرت بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدت خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اس شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی جان ہیں۔ اس پر اضافہ کیجئے اردو سی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا جس پر کلاسیکس کا دھوکا ہو۔

بعض صاحبوں کو غالب کی طرح ان کی مشکل پسندی کا رونا ہے اور وہ پیوند کاریاں جو ان کی شستہ رفتہ اور برجستہ اردو میں ہوتی ہیں جس میں انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے، عام خیال ہے کہ ثقل سے خالی نہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سب ان کی جدت اختراع اور قوت آخذہ کا زور ہے آمد

کی رو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بہ لحاظ ترکیب و تحلیل اجزائے السنہ غیر گنگا جمنی ہوتے ہیں، تاہم متانت اور حسن کلام سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتے جو ان کے لٹریچر کا خاصۂ طبعی ہے۔ نہ ان کے اچھوتے اور مستقل طرز ادا (اسٹائیل) پر جو شارع عام سے الگ تھلگ اور آپ اپنی نظیر ہے، کوئی اثر پڑتا ہے۔ جو باتیں اوروں کے ہاں بیگانی ہیں ان کی بے ساختگی اور برجستگی خیال کے ساتھ سلسلۂ بیان میں اس طرح جذب ہو جاتی ہیں کہ مغائرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر بھی جہاں تک اس حیثیت سے اعتراض کی گنجائش ہے، ادب چاہتا ہے۔ سبک نکتہ چینیوں سے ان کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ باوصف کمالات علمی جو ایک حد تک ان کے ہم عصروں کو بھی مرعوب کرنے والے تھے، ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاق سخن کی آزمائش کا بہتر سے بہتر پیرایہ کیا ہو سکتا تھا۔

جس طرح ناولوں اور تراجم میں بہ رعایت فن یہ اپنی قادر الکلامی کا بڑے سے بڑا ثبوت دے سکے، لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے، مثلاً فلسفہ، تاریخ وغیرہ، جس میں وسعت نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید، قوت استقرا، تفریع مسائل اور فلسفیانہ استخراج نتائج کے ساتھ غیر منقطع انضباط خیال کی ضرورت ہے، یہ قصداً اس طرف نہیں آتے۔ یہی حد فاصل ہے۔ جو شبلی کی قلم رو سے ان کے دائرہ کمالات کو جدا کرتی ہے اور یہی وہ آزادی ہے جس کے آثار ان کے لکچروں میں آپ دیکھیں گے اور جس کی بنا پر یہ اکثر کہا گیا ہے کہ وہ موضوع سخن کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا مرتبۂ انشا پردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ صرف زور بیان کا قصور ہے جو اظہار حقیقت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا۔

زمانہ کتنی ہی ترقی کرے اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کر سکتا جس کا

کوئی رونگٹا بے کار نہیں۔ جہاں تک لائق ادب "مشرقیت" کا تعلق ہے۔ قوم کی یہ آخری بہار تھی جس کے اجزاء کچھ اٹھ گئے، کچھ باقی ہیں۔ قدیم علوم کے نام لیوا ایک آدھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ جس عربی، مرحوم عربی کو ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈتے ہیں، علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہو گئی۔ مگر ان کا حصۂ غیر فانی یعنی ان کی تصنیفات مرنے والی چیز نہیں۔ وہ اپنی بقائے دائمی کی آپ ضامن ہیں اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا انجیل (آئڈیل) ہے جس سے دنیا میں کوئی بے نیاز نہیں۔

نذیر احمد کے استادانہ اور باوقار لٹریچر کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اب نہیں ہو سکتی، لیکن اخلاف کے لئے جس قدر سرمایۂ علمی انھوں نے چھوڑا ہے وہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ ہم ان کی قیمتی تصنیفات کو سینہ سے لگائیں گے، آنکھوں میں جگہ دیں گے۔ دائمی جدائی کے بعد ادائے سپاس کا حق کچھ تو ادا ہو رہے گا۔

6459

سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو بڑھے حالی ہیں۔ یہ ایک ہی وقت میں جہاں فطری شاعر ہیں، اعلیٰ درجہ کے ناثر بھی ہیں۔ لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے، جس نزاکت کے ساتھ ادائے خیال کے مختلف پہلوؤں سے دیکھتے دیکھتے یہ اپنا مطلب نکال لیتے ہیں کثرت مواد کے ساتھ بھی دوسرے اس قسم کے لطیف تصرفات نہیں کر سکتے۔ طبیعت میں ایک چچاتلا خاص طرح کا مادہ ہے جو حشو و زوائد سے غرض نہیں رکھتا اور ساتھ ہی کسی موضوع بحث میں ان نکات متعلقہ کی طرف نہایت خوبصورتی سے فوری انتقالِ ذہن کا باعث ہوتا ہے جو دراصل اس بحث کی جان ہوتے ہیں۔ لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں۔ یہ سلاست و نفاست قدرتِ کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصہ میں آئی۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے خیالات و مقالات میں جھول جھال یعنی کسی طرح کا "تذبذب فی الرائے" نہیں ہے۔ خالص یک رنگی ہے جسے اصطلاح میں فلسفیانہ کہئے۔ معیار خیال اس قدر بلند پایہ اور سلجھا ہوا ہے کہ کہیں سے یہ بیگانے نہیں ہوتے۔ مجھے ہنسی آتی ہے جب سنتا ہوں کہ حالی کی جدید شاعری بہ لحاظ فن ساقط المعیار ہے اور اس لائق نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے۔ یہ فتویٰ "پرانی لکیر" کے شیدائیوں کا ہے جو خیر سے یہ بھی نہیں جانتے کہ شاعری دراصل کیا چیز ہے اور اس کا موضوع اصلی کیا ہے؟ بھیڑوں کا ایک غول ہے جو مدت ہوئی آنکھیں بند کئے ایک راستہ پر پڑ لیا اور آگے پیچھے آج تک چلا آیا لیکن ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں نہ ہم اس مجموعۂ ردیات پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو پرانے خیال والوں کا سرمایۂ ناز ہے۔ ہم ایک حد تک معصوم حماقتوں سے کسی کی ہوں لطف اٹھانے کے لئے تیار ہیں کیوں کہ یہ بھی ایک عیش ہے۔ صرف اتنا کیجئے کہ برے بھلے حالی کو جدید گروہ کی لائق فخر پیشوائی کے لئے چھوڑ دیجئے۔ میرا خیال ہے حالی کے کلام پر مولوی عبد الحق کھل کر داد سخن دیں گے۔

یہ آج تک باوصف قابلیت اور فلسفیانہ مذاق کے صرف "مقدمات" پر ٹالتے رہے۔ ان کا مصرف صحیح کچھ اور تھا۔ ان میں مادۂ اختراعی (اریجنیلٹی) خاصا ہے مگر قوت فیصلہ کی کمی "صحافت" سے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ حالانکہ ان کا سلیقہ تحریر سفارشی ہے کہ مستقل تصنیف و تالیف کے سوا یہ کچھ اور نہ کرتے۔ بہر حال ان کو کم سے کم میری خواہش تو پوری کرنی ہوگی۔

یادش بخیر! شبلی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے زیادہ ایک زندہ مصنف پر قلم آزمائی کی گنجائش نہیں۔ چبائے ہوئے نوالوں کا بار بار منھ میں پھیرنا خواہ وہ کتنے ہی خوش ذائقہ ہوں، جدت طرازی جائز نہیں رکھتی اور چونکہ نئی بات نہیں کہہ سکوں گا اس لئے مختصراً اس قدر کافی ہے کہ شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ پر فلسفہ کا رنگ چڑھایا اور حکیمانہ انکشافات و نکتہ

آرائیوں سے اسے ایک مستقل فن دیا۔

علی گڈھ کو انھوں نے چھوڑا اور ندوۃ العلماء نے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے خود ان کو۔ لیکن میرا بس ہو تو شبلی کو ہندوستان سے باہر کالے کوسوں، یوروپ کے کسی "بیت الحکمار" (لٹریری اکیڈمی) میں بھیج دوں جہاں ان کو اپنی غیر معمولی قابلیت کی داد بڑے بڑے علمائے مستشرقین سے ملے گی جو بہ لحاظ ہم فنی ان کے یاران طریقت ہیں۔ شبلی کا وسیع دائرۂ تحقیقات، اہل زبان کی سی فارسی اس میں بھی شاعری کا ملکۂ راسخہ اور سب سے زیادہ اپنی زبان میں ان کی لائق رشک انشا پردازی، وہ صفات ہیں جو علانیہ ان کو ہم نفسوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ شعرالعجم کے چوتھے حصہ میں فلسفۂ شاعری پر مختلف پہلوؤں سے جس طرح تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے "ادب الاساتذہ" کا بہتر سے بہتر مرقع ہے جس پر دنیا کی کوئی زبان فخر کر سکتی ہے۔

اردو میں ان کے مطائبات نظم کو جو جدید پیداوار ہیں ان کے سلسلۂ کمالات سے علیحدہ کر کے دیکھئے جن میں لطائف ادبی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، یہ رنگ بھی ان ہی کا حصہ ہے۔ شوخی کے ساتھ سنجیدگی یہ معلوم ہوتا ہے دور سے زبان کی بلائیں لے رہی ہے۔

لیکن اسکی جامعیت کے ساتھ بھی سوال یہ ہے کہ قوم نے کہاں تک حوصلہ افزائی کی۔؟

کل کی بات ہے ایک اتفاقی واقعہ پر شبلی پر ملک کے چپہ چپہ سے لے دے شروع ہو گئی اور اس قدر غل شور ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے جس سے کچھ دنوں کے لئے اخباری افق کی فضائے بسیط ایک دم سے تیرہ و تار ہو گئی۔ کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟ ہرگز نہیں صرف حاسدین کی کم نظری تھی۔ دلوں کی جمی ہوئی سیاہی لغزش قلم سے ٹپکی اور

بری طرح ٹپکی۔ لیکن شرافت علم دیکھئے! شرر کو جو "شبلی" پر کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں کرتے تھے اس ناگوار واقعہ کے بعد جس کا انجام ندوہ سے مولانا کی دست کشی پر ہوا، اپنی آواز بلند کرنی پڑی۔ وہ صاف صاف کہہ گذرے کہ ندوہ میں جو کچھ دم تھا، شبلی کی وجہ سے تھا اب وہ ایک جسد بے روح ہے۔ اسی ضمن میں مولانا کے کمالات کا شناسانہ اعتراف اور قوم کی ناسپاری کا رونا تھا۔

"نقاد" میں تاریخ کا معلم اول، کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ ایک قاصر النظر نے اہتمام کے ساتھ "مشرق"[1] میں اس کی تردید کی جسارت کی لیکن عامیانہ و حاسدانہ۔ جس میں علامہ شبلی کو ان اوصاف سے معرا کر کے دکھایا تھا۔ جو مضمون نگار نے حسنِ عقیدت سے نہیں بلکہ خود "فلسفہ" کے ایما سے غیر فانی شبلی کی طرف منسوب کئے تھے۔

بہر حال میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شبلی پر اگر کوئی قلم اٹھانا چاہے تو جی لگنے کے سامانوں میں کمی نہیں۔ میرے خیال میں سید عبد الماجد اگر فلسفۂ تاریخ سے اتنی ہی دلچسپی کا اظہار کرتے جس اہتمام سے "الکلام" پر منحرفانہ نظر ڈالی گئی تھی تو کفارۂ معصیت کے ساتھ تنقید کا بھی حق ادا ہو جاتا۔

سب سے آخر، مگر دراصل سر فہرست آزاد پر میں خود کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ آزاد اس پایہ کے ادیب ہیں کہ ان کے دائرہ کے اور خلاقین سخن کو ان کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ آزاد کی جن حیثیتوں پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ پڑ سکتی ہے وہ تحقیقات السنہ کے مذاق کے ساتھ پاکیزگی زبان اور آزاد کا خاص انداز بیان ہے جس سے ان کی نثر عموماً زرنگار معلوم ہوتی ہے۔

ایک مغربی شاعر کے خیال میں جس نے شوخی سے عالم فطرت (نیچر) پر کمال صنعت (آرٹ) کو ترجیح دی ہے۔ خوش آب موتیوں کا نشاط انگیز انتشار

---

[1] گورکھپور سے شائع ہونے والے ایک اخبار کا نام۔ مرتب۔

کے ساتھ فرش ریشمی پر بکھر جانا روانیٔ آب سے زیادہ دلکش ہے مگر اس سے زیادہ تر دلکش ہے کسی نازک خیال مصنف کی مرصع پیداوارِ دماغی جو حسن صوری اور معنوی کے ساتھ آمد اور بے ساختہ پن کی تصویر ہو۔ اس کے سلیس و نفیس لٹریچر کا یہ وصف اضافی کہ روکھے پھیکے مسائل کو بھی اس لطافت سے جذب کر سکے کہ کہیں سے بار طبیعت نہ ہو، اور فسانے (یعنی لائٹ ریڈنگ) کا لطف آئے، میرا خیال ہے لائق ذکر خصائص میں سے ہے، جس کی بنا پر ایک مشہور موقع پر یہ کہا گیا تھا کہ "آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے۔"

جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا ہے، اردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہونچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں اور گو اس مسئلہ پر ابھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے، لیکن آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا جن حضرات کی نگاہیں دلی لکھنؤ کے اختلافات تک محدود ہیں یا جن کی قاصر النظری میرے اس خیال کی تائید کی مانع ہو وہ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں بلا خوف تردید یہ عرض کروں کہ پروفیسر آزاد کا درجہ بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفۂ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہے، آسان نہیں ہے۔ اس لئے کسی اختلافی بحث کا چھیڑنا "گول خانہ میں چوکھنٹی چیز" سے بھی زیادہ گیا گذرا ہوگا۔

سرسید سے "معقولات" الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن "آقائے اردو" یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ اسی لئے واقعات بھی انھوں نے جس قدر لکھے ہیں، "قصص" (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں "افسانہ یاران کہن" سمجھئے۔

اس بحث کو اصل تنقیدی مضمون میں پھیلاؤں گا، یہاں افتتاحی حیثیت سے بھی قوت کا صرف کرنا منظور نہیں۔ اسی سلسلہ میں آپ دیکھیں گے کہ جدید شاعری جس کے "آدم" حالی سمجھے جاتے ہیں، غالباً اس کی داغ بیل سب سے پہلے آزاد نے ڈالی تھی۔ مجھ کو آزاد کے لٹریچر سے غیر معمولی دلچسپی ہے اس لئے ذرا تفصیل کے ساتھ ان کی دلکش تصنیفات کے ان اجزا کو ابھار کر دکھاؤں گا جن کا ایک ایک حرف لٹریچر کی جان ہے۔

بہر حال ارکان خمسہ کی تجویز آپ کے سامنے ہے۔ اکبری نورتن کے مقابلہ میں بعض صاحبوں کو یہ تجدید پسند نہ آئے گی لیکن مجھے افسوس ہے۔ کہ مصنفین کی صف اول میں اس سے زیادہ گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔ تاہم غیر ضروری نکتہ چینی سے علیحدہ ہو کر اگر کوئی صاحب (بشرط کہ لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں) مجھے مفید مشورہ دے سکے تو میرا خیال ہے میں اس پر غور کرنے کے لئے ایک حد تک تیار ہوں۔

اس تجویز کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے ضرورت ہے کہ کم سے کم سو صفحے ہر مصنف کے نذر کئے جائیں۔ اس طرح پانچ سو صفحوں کی ایک کتاب تیار ہو جائے گی جس کا ایک طبع خاصہ (یعنی اڈیشن ڈی لکس) بہتر سے بہتر کاغذ اور چھپائی کے ساتھ شائع ہوگا جس میں مصنفین کے ساتھ منقدین کی ہاف ٹون عکسی تصویریں شامل کی جائیں گی۔ اس کی تکمیل مالی امداد سے قطعاً بے نیاز ہے۔ صرف ضرورت ہے تو ترتیب مضامین کی جس کی طرف ایک مرتبہ اور میں ان اصحاب کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جن کو فرداً فرداً میں نے نامزد کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔

اردو لٹریچر کا نفس واپسیں

اگر اردو لٹریچر کی ارتقائی تاریخ جہاں تک نثر سے تعلق ہے، کبھی لکھی گئی تو جو مرقع دفعتہً آنکھوں کے سامنے آئے گا وہ طبقۂ اول کے لکھنے والے ہوں گے۔ جن کو میں نے "عناصر خمسہ" کی حیثیت سے کہیں دکھایا ہے۔ جو سرسید کے زمانے سے پیدا ہوئے۔ آزاد کی زبردست شخصیت گو ایک حد تک سرسید کی تبلیغ سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ کیا کم ہے کہ ہم عصری کی عزت ان کو بھی حاصل تھی۔ اور مذاق سخن کے لحاظ سے وہ اُدھر جھک پڑے جو سرسید کے لٹریچر کا خاصۂ امتیازی تھا۔ نذیر احمد جس حد تک مستغنی رہ سکے ان کے خیالات و مقالات کا بہت بڑا حصہ خود اس فیصلہ کے لئے کافی ہے۔ رہے حالی و شبلی کچھ شک نہیں کہ یہ تمام تر سرسید کے پیدا کردہ ہیں۔

میں اس وقت طبقۂ ثانی کے اہل قلم سے قطع نظر کئے لیتا ہوں جو میرے دائرہ تحریر کے موضوع سے الگ ہیں۔ ورنہ اردو لٹریچر جب تک باقی ہے، ریاض احمد علی شوق، شرر اور سرشار ہمیشہ محبت آمیز عزت کے ساتھ یاد کئے جائیں گے۔ موجودہ لٹریچر کی خلاقی میں یہ داہنے ہاتھ نہ سہی، بائیں ہاتھ کی حیثیت قطعاً رکھتے ہیں۔ آج ریاض اور شوق کی لطافت نثر گذشتہ تاریخ کا ایک بھولا ہوا سبق ہے، لیکن کل کی بات ہے جب یہ دونوں اپنے وقت کے بہترین پرچوں میں دادِ سخن دے رہے تھے۔ آئندہ دنیا ان کو زیادہ سے زیادہ مٹی ہوئی شاعری

کی حیثیت سے جانے گی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ نظم کے ساتھ یہ نثر کے بھی "آقا" تھے۔ دونوں جوان تھے، جو بنوں پر آئی ہوئی زبان بھی پری بنی ہوئی تھی۔ "صحافت" رہ رہ کر جنبش قلم کی بلائیں لیتی تھی۔ عورت کیسی ہی نازک ہو لیکن چھڑوں کی دھیمی آوازیں جو کیفیت ہے اونچی ایڑی کے بوٹ کی کھٹ کھٹ میں نہیں، آج کل کی کھڑی اردو کے مقابلہ میں ان کی زبان میں ایک خاص لچک اور نزاکت تھی۔ شستہ رفتہ محاورات کی برجستگی اور موقع موقع سے روزمرہ کی پیوند کاریاں کس طرح دکھاؤں۔ دل کی بے چینی سطح کاغذ پر پھیلتی جاتی ہے لیکن حق ادا نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ جس طرح دل نہیں رہے، دلوں کے اکسانے کا سامان نہیں رہا۔ زمانہ کی ترقی کے یہ معنی ہیں کہ بعض اجزا ساتھ ہی ساتھ اس طرح مٹتے گئے کہ بجھے ہوئے چراغوں کی طرح کہیں پڑے ہیں، لیکن جو آنکھیں برقی خیرہ گیری کی عادی ہو رہی ہیں، انھیں فرصت ذوق کہاں کہ ایک نگاہ ادھر بھی ڈالیں۔ شرر اور سرشار کی نسبت کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ یہ اپنی بقا کے آپ ضامن ہیں، یعنی ایسی لائق رشک ہستیاں رکھتے ہیں جو مرنے کے بعد بھی فنا ہونے والی نہیں۔

میں پھر سلسلہ سے علیحدہ جا پڑا، ہاں تو کہنا یہ تھا کہ طبقۂ اولیٰ کی پاک روحوں نے جو سرمایہ ہمارے لئے چھوڑا ہے وہ کتنا ہی لائق ادب ہو لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے مرتبہ کے لحاظ سے اس کی کیا حالت ہے یعنی ہر مصنف نے اپنی تصنیفات میں کہاں تک اپنا درجہ قائم رکھا۔؟

یادش بخیر، شبلی کے سوا مجھے خوف ہے، سب کم و بیش وہ نہیں کر سکے تو ان کی قابلیت کا بہترین مصرف تھا۔ پروفیسر آزاد کی فارسیت، اہل زبان سے دبتی ہوئی نہیں تھی لیکن وہ اپنی نہایت قیمتی تالیف یعنی "جامع اللغات" کی تکمیل نہ کر سکے جو ان کی ساری عمر کی کمائی تھی۔ اسی طرح تذکرۂ شعرائے فارسی بھی جو خاص ان کے مذاق کی چیز تھی۔ مسودہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔

مولانا نذیر احمد کو اپنی اعلیٰ درجہ کی عربیت کے ساتھ "قاموس الاسلام" (انسائیکلوپیڈیا) کے لکھنے کا خیال نہ آیا، وہ اس پیمانہ کو گھٹا کر کم سے کم "لغات اسلام" لکھ سکتے تھے اور یہ پھر بھی ایسی چیز ہوتی کہ یورپ اپنی فلسفیانہ تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ آئندہ نسلوں کے لئے یہ قیمتی وراثت موصوف کی باقی رہنے والی یادگاروں میں سب سے زیادہ پیش پیش ہوتی۔

حالی، خوش صفات حالی سے ہم کو چنداں شکایت نہیں "مسدس" کے بعد "مقدمہ دیوان" اور "حیات جاوید" کے سوا اگر یہ کچھ نہ لکھتے تو ان کی بقا کے لئے اس سے زیادہ ضرورت نہ تھی، گو اس کا افسوس ہے کہ ان کی صحت اور عمر نے اتنا موقع نہ دیا کہ ان کی وسیع المشربی اور فلسفیانہ نکتہ سنجی ان کے نتائج افکار کی تعداد میں کچھ اور اضافہ کرتیں، جس کی اس لئے زیادہ ضرورت تھی کہ ان کے بعد ان کے رنگ میں کوئی قلم اٹھانے والا معلوم نہیں ہوتا۔

خاتم المصنفین، شبلی نے ہمارے لئے کم و بیش ۵ ہزار صفحوں کا ذخیرۂ ادب چھوڑا ہے، یہ لٹریچر کی وہ قیمتی صنف ہے جسے آج کل اصطلاح میں "تنقیدات عالیہ" (ہائر کریٹی سزم) کہتے ہیں۔ آپ لوہے کے چنے کہیئے اور میرا خیال ہے اسلام کے متعلقات میں اتنا بڑا سرمایہ اور وہ بھی اس قدر گراں پایہ کسی زبان میں موجود نہیں ہے، شبلی میں ایک خاص طرح کا مادۂ اختراعی تھا۔

وہ ایک ہی وقت میں اعلیٰ درجہ کے مورخ، اعلیٰ درجہ کے ناشر، اعلیٰ درجہ کے شاعر، غرض مشرقی زبانوں میں مختلف اصناف سخن کے پورے مالک تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یورپ کے مستشرقین کی طرح ان کا معیار تصنیف اتنا بلند تھا کہ میرا خیال ہے سینکڑوں برس بعد بھی ان کی تصنیفات ٹکسال باہر نہیں ہوں گی، ایسا جامع حیثیات مصنف غالباً اب پیدا نہیں ہوگا، ان کے تفصیلی کارنامے انشاء اللہ "دارالمصنفین" دکھائے گا۔ لیکن مرحوم نے سب کچھ کیا، آں حضرتؐ

کی لائف کی تکمیل نہ کر سکے جس کا داغ ہمارے ساتھ وہ بھی لیتے گئے۔ اسی طرح مسلمانوں کی عام تاریخ نہ لکھی جس کی سخت ضرورت تھی، نہ "شعر العجم" کی طرح عربی لٹریچر کی تاریخ لکھنے کی نوبت آئی اور سلسلے بھی ناکام رہے، جن کی تکمیل اب قیامت تک ہو چکی۔

بات یہ ہے کہ جب ہمارے ہاں محرکات میں اس کے سوا کچھ نہ ہو کہ ہر فعل خود اپنی مکافات ہے" تو ان اساتذہ سے جو کچھ ہاتھ آیا وہ بھی ہمارے استحقاق سے کہیں زیادہ تھا۔

علی گڑھ ایک تاریخی قوم کی مرکزیت کا مدعی ہے لیکن لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی قوم نے کوئی دائرۃ التالیف قائم نہیں کیا نہ ان عناصر کو جن کے نام بار بار گنا تا رہتا ہوں وہ کبھی تصنیف و تالیف کے لئے یکجا کر سکا اردو لٹریچر کا اطلاق صحیح معنوں میں صرف انھیں حکمائے ادب کی دماغی پیداوار پر ہو سکتا ہے، اگر آپ کو اس سے اتفاق نہ ہو تو اسے اپنی قاصر النظری اور قوم کی "شامت اعمال" پر محمول کیجئے، جس کو اتنا بھی احساس نہیں کہ تصنیفی دور آخری تاجدار سخن یعنی شبلی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے پیوند خاک ہو گیا۔

سب تو سب حیدر آباد سی شائستہ ریاست کو یہ خیال نہ آیا کہ سید علی، آزاد، نذیر احمد اور حالی و شبلی کو جن میں آزاد کے سوا سب اس کے خوان نعمت کے خوشہ چین تھے، صرف تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دیا جائے۔ یہ لوگ معقول وظیفوں پر ایک جگہ رکھے جاتے اور یہ طے کیا جاتا کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے کون کون کام ترتیباً زیادہ اہم ہیں اور ان پر عالمانہ کتابیں لکھوائی جاتیں، سید علی سا ہمہ دان جہاں موجود ہو وہاں "اکبری نورتن" کی طرح "پنجتن آصفی" کا عالم وجود میں نہ آنا ایک ایسی بدنصیبی ہے جس کی تلافی اب کبھی نہیں ہو سکتی۔ "سلسلۂ آصفیہ" اگر برائے نام نہ ہوتا اور فرماں روائے وقت کو کچھ بھی دلچسپی ہوتی تو دیکھ لیتی کہ "عہد عباسیہ" جہاں تک ادبی فتوحات کا تعلق ہے۔ نئے سرے

واپس آگیا ہے۔ لیکن گذری ہوئی بات کا رونا کیا، میں پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ملک کا تصنیفی دور ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، بیشک کتابیں آئندہ بھی لکھی جائیں گی لیکن میری غرض ردیات سے نہیں، اعلیٰ لٹریچر سے ہے جس کی فصل ایکدم سے ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

ثبوت لیجئے! علی گڈھ کالج ۴۰ سالہ جدوجہد کے بعد ایک مصنف بھی اس وقت تک نہ پیدا کر سکا۔ آپ جانتے ہیں یہ کس بات کی پھٹکار ہے۔؟ نری انگریزی دانی سے خواہ وہ کسی پایہ کی ہو مشرقی طبایع میں مادہ نہیں ہوتا، لڑکوں کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ انگریزی سے پہلے یا ساتھ ساتھ عربی فارسی کی تحصیل کر سکیں جس پر ان کی مادری زبان کی ترقی کا انحصار ہے۔ زبان عربی میں کتنی ہی دستگاہ ہو لیکن اس طرح لکھنا پڑھنا مشکل ہے کہ اہل زبان کو اس میں لطف آئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی ٹکسالی ہونے سے رہی، اردو میں یہ اظہار خیال کرنا نہیں چاہتے، یا صاف کیوں نہ کہوں ان کو آتی ہی نہیں اور چونکہ اردو لٹریچر سے بیگانگی کو یہ اپنا شرف امتیازی سمجھتے ہیں، اس لئے ان کے ہاتھوں ابھی مدتوں ہم کو اردو ادب میں کسی اضافہ کی امید نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ کوئی قوم دنیا میں اپنے مجموعۂ خصائص سے علیحدہ ہو کر ترقی نہیں کر سکتی تو صرف یہی نہیں کہ آج کل کے نوجوانوں کے لئے مادری زبان کا رونا ہے بلکہ ایک وسیع حد تک انکے مستقبل کی طرف سے بھی مایوسی ہے۔

یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ جو بساط ابھی دیکھتے دیکھتے اٹھ گئی یعنی لٹریچر کے جو حقیقی مالک تھے وہ قریب قریب سب ایسے تھے۔ جنھیں مشرقی تعلیم نے پیدا کیا تھا۔ اور جن کو "مغربیت" کچھ یوں ہی سی چھو گئی تھی، لیکن ان کی قوت اجتہادی کا مظہر وہ معرکۃ الآرا سرمایۂ ادب ہے جو ورثہ میں وہ ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ بہر حال نوجوان طبقہ کی بیگانہ وشی بہت ہی لایق افسوس ہے لیکن دنیا میں کوئی کلیہ نہیں جس میں استثنا نہ ہو۔ میں دیکھتا ہوں اس

طبقہ میں ایک شخص ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اوروں کی ناک رکھ لے گا، میری غرض لائق عبد الماجد[1] سے ہے جو انگریزی کی تکمیل کے ساتھ اردو لٹریچر کا نہایت صحیح مذاق رکھتے ہیں اور آج ان کے قلم کے سایہ میں دو فلسفیانہ کتابیں ایسی موجود ہیں جن پر ادب اردو ناز کر سکتا ہے۔ چونکہ شروع ہی سے پیمانۂ تصنیف اونچا اختیار کیا گیا ہے اس لئے آئندہ ہم کو ان سے بہت سی توقعات ہیں ابھی زیادہ کھلنا نہیں چاہتا کیوں کہ ان کو نظر بد کے اثر سے بچانا ہے۔

شبلی کا مطمح نظر ایسی ہی تعلیم تھی جس میں انگریزی کے ساتھ مشرقی زبانوں کی بھی تکمیل ہو اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ "دار المصنفین" جو چند نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے، مرحوم کے خیالات کی تصویر مرئی ہے۔ جس قابلیت کے ساتھ مولوی سلیمان ندوی ایک مختصر علمی جماعت سے کام لے رہے ہیں اور جس پیمانہ پر وہ تالیف و تصنیف کے صیغہ کو وسعت دینا چاہتے ہیں، میرے دعویٰ کے ثبوت میں ہے کہ نری انگریزی دانی کسی درجہ کی ہو قوم و ملک کے لئے جہاں تک دماغی مشاغل کا تعلق ہے ایک بیکار سی چیز ہے، "معارف" کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ رفقاء دار المصنفین کیا کرنا چاہتے ہیں اور خیر الاخلاف ہونے کی ان میں کہاں تک اہلیت ہے۔ میرا خیال ہے تصنیفی افق جو ایک دم سے تاریک ہو گیا تھا دفعۃً امید افزا ہو چلا ہے اور اگر موجودہ رفتار بھی قایم رہ سکی تو اس علمی جماعت کی متفقہ کوشش سے ایک نئے دور کا آغاز ہو گا، جس کی نہایت سخت ضرورت ہے۔

انجمن ترقی اردو سے چنداں امید نہیں لائق سکریٹری ہر سال چند بے غایت رسائل کی اشاعت کو فرض کفایہ سمجھتے ہیں لیکن اس قسم کی بے اصول اور خود رو اشاعت سے زبان کی ترقی نہیں ہوتی۔ میں نہیں جانتا اس وقت تک کوئی لائق ذکر کام کیا گیا ہے جس سے کسی حد تک زبان کا دائرہ وسیع ہوا ہو۔ "فلسفۂ تعلیم" کے بعد

---

[1] مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم و مغفور۔ مرتب۔

"فلسفۂ جذبات" اور فلسفۂ اجتماع کی اہمیت سے ناواقف نہیں ہوں، لیکن ان کو چھوڑ دیئے، محض طالب علمانہ رسائل جن کا آئے دن اعلان ہوتا رہتا ہے اور جن میں اظہار خیال کی حیثیت سے مجتہدانہ روح نہ ہو، کس کام کے ہیں۔ انجمن کو سرے سے یہی نہیں معلوم یا وہ جاننا نہیں چاہتی کہ کس زبان کی ترقی کے عناصر ترکیبی کیا ہوتے ہیں۔ یہ بات حیدرآباد یا لکھنؤ میں چند افراد کی خودرائی سے طے نہیں ہو سکتی، یورپ کے کسی مستشرق سے پوچھئے جو دنیا کے مختلف لٹریچر کے نظامات طبعی پر غائر نظر رکھتا ہو، تو وہ بتائے گا، دراصل آپ کے کرنے کے کام یہ ہیں۔

(۱) جامع اللغات اردو

(۲) محاورات

(۳) لغات الاصطلاحات

(۴) لغات فارسی (جہاں تک اردو کی تکمیل کا تعلق ہے)

(۵) لغات عربی۔ بہ ترتیب جدید

(۶) ادب العالیہ (اردو) ۱۲ ضخیم جلدوں میں

(۷) جامع القواعد (اردو)

(۸) عقلیات (یعنی فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب)

(۹) اردو انسائیکلو پیڈیا۔

ارتقاء زبان کی قدرتی ترتیب یہ ہے کہ اس میں صالح لٹریچر کا کافی سرمایہ موجود ہو۔ حسن اتفاق سے ہمارے پاس ایسا ذخیرہ موجود ہے کہ ہم دنیا کی اور کلاسیکس (ادب القدماء) کے مقابلہ میں اسے بے تکلف پیش کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد اردو لغات کی تدوین و ترتیب ہے جس کی اہمیت اس قدر طے شدہ ہے کہ جب تک آپ سے ختم نہ کر لیں کسی دوسرے موضوع پر ادھوری طبع آزمائی نیک نیتی کے ساتھ بھی دھوکا دینے سے پہلے دھوکا کھانا ہے۔ اردو لغات کے سلسلہ

میں "فرہنگ آصفیہ" کو یاد نہ کیجئے جو حشو و زوائد سے بھری ہوئی ہے جسے کاغذی کاسۂ گدائی سمجھئے جس کی تدوین آج تک ختم نہ ہوئی اور جس کے اجزاء ہزاروں روپیہ ضائع کرنے کے بعد بھی یک طرحی اور ہم رنگی نہ پیدا کر سکے۔ بہر حال سب سے پہلے آپ کو لغت تیار کرنا ہے اور ایک ہی سانس میں روزمرہ اور محاورات کو یکجا کرنا ہے جن سے زبان کی آرائش ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی نزاکتیں، زبان کے حسن اور اس کی کیفیت کو بڑھاتی چڑھاتی ہیں۔ آپ کو شائد یہ معلوم نہیں کہ اردو اپنے ذخیرۂ محاورات کے لحاظ سے نسبتاً دوسری زبانوں سے دوم درجہ پر نہیں ہے اس نے دنیا کی اور کلاسیکس یعنی زندہ اور مستند زبانوں سے جو کچھ لیا، اس سرمایہ کا بہت بڑا حصہ جو امانت دار تھے ان کے ساتھ ضایع ہو چکا بچے کھچے بکھرے ہوئے موتی دلی لکھنؤ میں کچھ اب بھی مل جائیں گے، ان کو سمیٹئے اور گلے کا ہار بنائیے۔

جذبات عشق نے دنیا میں ہمیشہ مشق سخن کی ہے اور نازک سے نازک پیرایہ اظہار خیال پیدا کئے ہیں۔ آج کسی کو فرصت و لیاقت ہو تو مشرق کو مغرب سے ٹکرا کر ایسی آگ پیدا کی جا سکتی ہے جو دلوں کو جلائے گی نہیں صرف گرمائے گی۔ لیکن جن کو گھر کی خبر نہیں وہ غیروں کی نکتہ آرائیوں سے کہاں تک لطف اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سرسری طور پر دو مصرع لیجئے جو جذبات میں ڈوبی ہوئی اس سے کہہ رہی ہے جس کے دل کی مالک ہے۔

کر چکے تم تو دشت پیمائی
مجھ سے گھر بیٹھے خاک چھنوائی

اور دنیا کی کسی زبان میں یہ بات دکھا دیجئے جو ان نہایت سلیس لیکن فصیح مصرعوں میں ادا کی گئی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے آپ کی اردو بڑی بڑی آبرودار زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ ہزاروں محاورات ہیں جو دلی اور لکھنؤ والوں کے روزمرے میں داخل ہیں اور جن پر جان دینے کو جی چاہتا ہے۔

محاورات تو پھر بھی ایک چیز ہیں، لیکن اس کے توابع مہمل بھی اتنے دلکش ہیں کہ یہ کہیں اور نہ دیکھے گا۔ بیشک اردو فنا ہونے والی نہیں اور وہ اس وقت تک زندہ رہے گی کہ بیویاں تو خیر، گھر کی ایک ماما بھی چمک کر "نوج" کہنے والی موجود ہے۔ لیکن میری غرض یہ ہے کہ ایسی خوبصورت، ایسی خوش سیرت، ایسی لطیف و نکتہ خیز زبان اگر آپ کے ہاتھوں اپنی عزتِ نفس کو قائم نہ رکھ سکی تو اس کا ہونا گویا نہ ہونا ہے۔

ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ لغاتِ اردو کے بعد اصطلاحات کا درجہ ہے۔ یہ پہلی شق سے کم نہیں ہے۔ مغربی لٹریچر کو اگر آپ اردو قالب میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مصر سے ذخیرۂ الفاظ منگوایا جائے۔ میری غرض علوم و فنون سے زیادہ کمالِ انشا پردازی سے ہے۔ ہم اچھے سے اچھے خیال کو اردو میں اس لئے نہیں لے سکتے کہ الفاظ نہیں ملتے۔ اس لئے دل کا ارمان پورا نہیں ہوتا یعنی ہم ایک خاص طرح کے گونگے ہیں کہ سننے اور سمجھنے کے بعد بھی کسی خیال کو اپنی زبان میں ادا نہیں کر سکتے، سکریٹری صاحب انجمن اردو نے اپنی ایک رپورٹ میں علم ہیئت کے مصطلحات کے جمع کرنے کی بشارت دی تھی لیکن ممدوح کو یاد نہیں رہا کہ "کار زمین کو تکمیل سے پہلے با آسمان پرداختن" ایک غیر طبعی بلند پروازی ہے جس سے بجائے اس کے کہ لٹریچر کے مختلف زاویوں کی توسیع ہو اس کی حق تلفی ہوتی ہے اور یہی غیر منطقی ترتیب ہے جس سے آج تک صرف اتلاف قوت ہوتا رہا اور کوئی کام کی بات نہ ہوئی۔

قوم میں لکھے پڑھے (صحیح معنوں میں) تھوڑے ہیں، ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو صحیح قوت فیصلہ رکھتے ہوں یا جن کے دماغ میں لٹریچر کے نازک مسائل کے جذب کرنے کی صلاحیت ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ نہایت موٹی باتیں بھی ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں جو ایک مخلوق بے غایت یعنی ۶ کروڑ "عشرت الارض" کی ادبیات کے نقیب بننا چاہتے ہیں یقین کیجئے، ان دماغوں

کی ساخت دنیا کی طبی معلومات میں اضافے کرے گی جن کو ترک "فرائض" کا احساس نہیں لیکن "نوافل" پر اصرار ہے۔ آپ کہتے ہیں البیرونی اور "مقدمات الطبعیات" پڑھو! جن میں ایک حرف مجتہدانہ نہیں، مجھے نہایت ادب سے یہ عرض کرنا ہے کہ ان کے پڑھنے کے بعد بھی میں اتنا ہی کورا رہا جتنا استفادہ سے پہلے تھا، درد سری بیکار گئی جس کا افسوس ہے۔

میں یہ لکھ رہا ہوں اور عنقریب علی گڈھ میں دوم درجہ کی تالیفات کی دوسری کھیپ یا اس کا اعلان ماسبق، حسن کارگذاری کا دفتر بڑھا رہا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ لٹریچر صرف سادے کاغذ پر سیاہی پھیلانے سے کہاں تک حقیقی فوائد حاصل کر سکتا ہے؟ وقت کا فیصلہ تو کچھ اور ہے۔ وہ صاف صاف کہہ رہا ہے

"ایں بجوئے مانمی ارزد"

بہرحال مصطلحات اردو اس قدر ضروری ہیں کہ ان کے ہوتے کسی "ورکا" کو شروع کرنے کی ضرورت نہیں۔ لغات جدیدہ جس میں ایک فاضل مولف نے ۴ ہزار الفاظ جمع کر دیئے ہیں، آنکھ رکھ کر نہ دیکھنے والوں کی چشم نمائی کے لئے کافی ہیں۔ کم سے کم اس کے پانچ سو صفحے تو ہوں، خیالات کا سلسلہ ہے کہ ختم نہیں ہوتا، اور مجھے ابھی کچھ اور کہنا ہے، کسی زبان کے ابتدائی نشو اور ارتقاء تدریجی کے لئے جس قسم کے وسائل ترتیبی کی ضرورت ہے، ایک یورپین مستشرق کے خیال کے مطابق جستہ جستہ عرض کر چکا ہوں اور یہ وہ منطقی ترتیب ہے کہ اگر واقعی اردو لٹریچر کو زندہ رکھنا ہے تو ایک منٹ کے لئے بھی اس سے قطع نظر نہیں ہو سکتی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ کرنے والے کہاں سے آئیں گے۔ جو لوگ کر سکتے تھے وہ آج منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں علی گڈھ کی مقتدر جماعت نصف صدی کی مشق و مہارت کے بعد بھی اس لائق نہیں کہ زبان کے مسئلہ پر اس حیثیت سے غور کرے کہ بقائے قوم کے لئے

اگر اس کی ضرورت ہوا سب سے زیادہ قوی عنصر یہی ہے۔ کانفرنس اس قسم کی تضیع اوقات پسند نہیں کرتی، وہ ایک عملی چیز ہے، سرسید کے وقت میں ایک آدھ لکچر ایسے ہو جاتے تھے جن پر انشا پردازی کچھ دنوں اتراتی رہتی تھی، اب فرط سنجیدگی نے یہ سلسلہ بھی باقی نہیں رکھا۔

قوم میں بہ ہیئت مجموعی جہاں تک نفس لٹریچر کا تعلق ہے کوئی روح اجتماعی نہیں۔ امراء کو صرف اسی کا شوق نہیں، ملک میں کبھی کبھی خارجی اسباب سے عارضی تحریک پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ باسی کڑھی کا ایک اُبال ہوتا ہے نہ آیا اور گیا۔ لٹریچر کا مذاق صحیح نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ یہ وہ راز ہے۔ جس کی بے نقابی لٹریچر کے ساتھ مٹنے والی قوم کے مستقبل کو صدیوں پہلے دفعتاً ہمارے پیش نظر کر دیتی ہے۔ جس طبقہ سے بڑی امیدیں تھیں۔ وہ "بالغ العلوم" ہونے کے بعد بھی اپنی زبان سے ناآشنا سا رہتا ہے جس کی خوش بیانی اور لطافت کا اسے بالکل احساس نہیں۔

عورت کتنی ہی حسین ہو، لیکن چاہنے والا اس کی خوش ادائی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے تو آرزوؤں سے بھرے دل پر کیا گذرے گی۔ ایسا سہاگ کس کام کا جو جیتے جی بیوگی سے بھی گیا گذرا ہو۔ غرض اردو کی طرف سے یہ بے التفاتی ایک قومی مسئلہ ہے جس پر ملک کے شائقین ترقی کو اپنی سب سے پہلی فرصت میں توجہ کرنی چاہیئے۔

میں پھر اعادہ کرتا ہوں کہ تصنیفات کا دور ختم ہو چکا لیکن جو کتابیں پڑھنے کے لائق ہیں ان کو بھی لوگ نہیں پڑھتے۔ اس سے زیادہ خراب حالت صحافت کی ہے جو رائج الوقت لٹریچر کو وقف عام کرنا چاہتی ہے۔ اخبار اور رسالے، عالم وجود میں آنے کے بعد ایک وقت خاص تک آپ ہی آپ چلتے ہیں یعنی شائع کرنے والوں کی وضعداری ان کو جاری رکھتی ہے لیکن آخر کب تک؟ بہار سے پہلے ان کے حصہ میں خزاں آتی ہے اور یہ ان کی غایت ہوتی ہے جن کی دماغی

تفریح کے یہ جراثیم ذمہ دار ہوتے ہیں۔ خریداروں میں مشکل سے دو چار کو آپ زر بکف پائیں گے اور نہ حصۂ غالب ادائے قیمت کو ایک طرح کی شکست سمجھتا ہے۔

تجارتی لٹریچر سے قطع نظر کیجئے، اچھے اچھے اخبار اور رسالے صرف چار دن کی چاندنی ہیں کہ آئی اور گئی۔ بہتیرے بند ہو گئے کچھ سسک سسک کر چل رہے ہیں۔ ایک آخری ہچکی کے ساتھ یہ بھی رخصت! یہ مادیت کا دور ہے، ہر چیز اپنی قیمت چاہتی ہے۔ نرے توکل سے کام نہیں چلتا جسے آج کل فاقہ کا مرادف سمجھئے۔ ہمارے ہاں جس طرح پڑھنے کا دستور نہیں، ادائے قیمت بھی شائستہ زندگی کا کوئی اصول نہیں اس لئے مدتوں یہ امید نہیں کہ صحافت ہماری زندگی کی رونق بڑھائے اور جب سرے سے دو وقت کی روٹیوں کے ہی لالے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا ایک فاقہ مست طبقہ خون جگر سے کہاں تک ہمارے ادبی مذاق کی شادابی کو قائم رکھ سکتا ہے۔

بہر حال اردو کانفرنس ہو یا انجمن ترقی، اسٹیج کی خوش بیانی سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس امر پر غور کریں کہ موجودہ نسل کو کس طرح اردو داں بنایا جائے جس کی حالت اس بگڑی ہوئی عورت کی سی ہے جو شوہر کے ہوتے "بوئے غیر" کی شائق ہو، اور وہ کون سے وسائل ہیں جن سے طبائع عام کی بے التفاتی میں ترغیب و تشویق کی روح پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ مسئلہ فی نفسہ اس قدر مہتم بالشان ہے کہ اسے صرف اردو لٹریچر نہیں بلکہ قوم کا عنوان زندگی سمجھئے۔ اگر اسے آپ سلجھا سکے، یعنی قوم کے وجدان و مذاق میں جہاں تک زبان کا تعلق ہے کوئی مستقل تغیر پیدا ہو سکا تو میرا خیال ہے فضائے تاریک بتدریج صرف ہوتی جائے گی اور جن تالیفات کی ضرورت دکھائی گئی ہے، ان کی ترتیب ہم کو اپنے مقاصد کی تکمیل سے قریب تر کر دے گی۔ دنیا میں کوئی قوم دکھا دیجئے جس نے اپنی زبان سے

علیحدہ ہو کر ترقی کی ہو۔ آج یہ طے شدہ ہے کہ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک اتحاد مذہب کے ساتھ اس میں اتحاد خیال اور اتحاد زبان نہ ہو۔ مذہبی اتحاد کو تیرہ سو برس کافی نہ ہوئے، اسی طرح امید نہیں کوئی قومی تخیل قوم کی مشترک خواہشات کا مرکز عام ہو، لیکن زبان کی یہ حالت نہیں۔ مدت کی منہ لگی اور اختیاری ہے، فلسفہ کا یہ مسئلہ کہ مستقبل ہمیشہ ماضی اور حال کا نتیجہ اضطراری ہوتا ہے قریب قریب سائنس یعنی یقینیات کی حد تک پہونچ گیا ہے۔ جو دور ابھی ختم ہوا ہے وہ لٹریچر کا عہد زریں تھا، آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ کسی طرح عہد موجودہ کو سنبھال لیجئے تو حصول کامیابی چنداں دور نہیں۔

لیکن جس پیمانہ پر آپ آج تک چلتے رہے اس کی خودروی منزل بے غایت کی ایک بھول بھلیاں ہے جس کے چکر، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے آپ کو مقصود سے ہمیشہ دور رکھیں گے۔ اب بھی وقت ہے کہ پچھلی حماقتوں کی تلافی کیجئے اور سوچ سمجھ کر طے کر لیجئے کہ جہاں تک اردو لٹریچر کی ترقی تو خیر، بقا کا تعلق ہے دراصل ہم کو کیا کیا کرنا ہے۔

میں پھر آپ کے ہاتھ میں سو سوا سو صفحوں کا ایک نامکمل رسالہ دیکھ رہا ہوں جس کو آپ دل ہی دل میں اردو کی لایق رشک فتوحات میں سمجھ رہے ہیں، مگر یہ میری چڑھ ہے۔ آپ کی خودرائی بزعم خود تعلیم یافتہ دماغ کی ایک اپج سہی۔ لیکن مجھ کو اگر آپ کی مجتہدانہ قابلیت میں شک ہو تو لایق معافی ہوں میں نہیں مانتا کہ آپ کی نظر ان نکات پر حاوی ہے۔ جو کسی زبان کی قدرتی ترقی کے عناصر موثر دیعنی ایسے اجزائے ترکیبی ہیں جن پر قواماً اور براہ راست زبان کا بننا بگڑنا منحصر ہے۔ اس لئے بلا خوف تردید پھر کہتا ہوں کہ جب تک اردو کے پاس ایک ضخیم جامع اللغات اور محاورات و اصطلاحات کا پورا دفتر نہ ہو آپ کی ناقص اور ادعائی کوششیں "نادان دوست" کے خلوص سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

آپ شاہراہ سے کترا کر تنگ گلیوں، ناہموار راستوں سے قطع منازل چاہتے ہیں اور یہ جہاں تک کمالات علمی کا تعلق ہے ایک غیر حکیمانہ روش ہے۔ لٹریچر کا آخری نوٹس یہ ہے جسے یاد رکھئے کہ

"عمارت میں ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ ہوگی"

شبلی سوسائٹی

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

حیدرآباد کی "بزمِ ادب" چاہتی ہے کہ ایک شبلی سوسائٹی قایم کی جائے جس کے مقاصد ہلکے ہوں یعنی شبلی اکیڈمی کی طرح سخت اور ٹھوس نہ ہوں، لیکن قبل اس کے کہ میں اس قسم کی سوسائٹی کی ضرورت پر نظر ڈالوں، مجھے دیکھنا ہے کہ جس کی یادگار قایم کرنی ہے وہ کس پایہ کا شخص تھا۔

کم و بیش ۳۰ برس ہوئے مولانا نے مشرقیات پر طبع آزمائی کے لئے جہاں تک اسلامی علوم کا تعلق ہے ایک اسکیم تیار کی تھی جو خواص تک محدود رہی اور جس کی عام طور پر اشاعت نہیں کی گئی۔ اس کی تفصیل ممدوح ہی کی زبان سے سنیئے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے واسطے یہ فرض کرنا چاہیئے کہ زمانہ اپنی موجودہ ضرورتوں کے ساتھ قائم ہے، لیکن بجائے موجودہ نسل کے ہمارے اسلاف کا علمی گروہ دوبارہ دنیا میں آگیا ہے۔ اس حالت میں غور کرو اس گروہ کے علمی مہمات کیا ہوں گے؟ اس سوال کا جواب قیاسی اور فرضی نہیں بلکہ اصول تجربہ کے موافق دیا جا سکتا ہے۔ علمائے سلف اور ان کے علمی کارنامے دونوں ہماری آنکھ کے سامنے ہیں نیز ہر شخص جانتا ہے کہ دولت عباسیہ کے

وجود کے ساتھ جب نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں تو دفعتاً ایک انقلاب ہو گیا۔ سب سے پہلے علماء کا ایک گروہ پیدا ہوا جس نے یونانی، فارسی، سریانی، کالدی، ہندی اور قبطی زبانوں کے علوم و فنون ترجمہ کے ذریعہ سے عربی زبان میں منتقل کر دیئے، ایک دوسرے گروہ نے ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اسلامی علوم کے سادہ ایوان پر مینا کاریاں اور نقش آرائیاں کیں، عقائد نے علم کلام کی صورت اختیار کی، عربیت نے ریٹرک (معانی و بلاغت) کا قالب بدلا، اصول فقہ میں منطقی استدلالات پیدا ہو گئے، تفسیر میں فلسفہ کی آمیزش ہو گئی، فرائض میں علم حساب کے دقیق اصول شامل ہو گئے۔ ان باتوں کے ساتھ علوم قدیمہ کی غلامی نہیں کی، بلکہ جو کچھ کیا آزاد و خود مختار بن کر کیا۔ جہاں غلطیاں دیکھیں اصلاح کی، جو فضول حصہ تھا اس کو الگ کر دیا، پریشان اور غیر مرتب مسائل نئے سرے سے درست کئے، جس قدر حصہ اسلامی علوم میں تحلیل ہو سکتا تھا۔ تحلیل کیا، جو بالکل جدا تھا اس کو مستقل حیثیت سے قائم رکھا۔"

مولانا مزید گہر افشانی یوں فرماتے ہیں۔

آج بعینہ اسی قسم کی حالت اور اسی قسم کا موقع ہے۔ یورپ نے تمام علوم و فنون کا قالب بدل دیا ہے۔ فلسفہ نے بالکل نئی صورت اختیار کی ہے۔ منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہوئے ہیں، معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا ہے، تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے۔ مذہبی مباحث کے نئے نئے پیرائے نکل آئے ہیں۔

اسی گذشتہ مثال کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج اگر اسلاف موجود ہوتے تو علوم و فنون جدیدہ کو پیش نظر رکھ کر وہی کرتے جو انھوں نے علوم قدیمہ کے ساتھ کیا تھا۔ علم کلام کو فلسفۂ جدید کے مقابلہ میں مرتب کرتے، تاریخ اور واقعہ نگاری کا انداز بدلتے، مسائل جدیدہ کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام علوم و فنون کے متعلق قدیم و حال کی تحقیقات کا موازنہ کرتے اور دونوں

کے عیب و ہنر دکھا کر فیصلہ کرتے کہ کیا چیزیں کس حد تک قبول کے قابل ہیں۔ اور نئی تحقیقات کو علوم قدیمہ کے ساتھ کیوں کر پیوند دیا جا سکتا ہے یا ان کے نمونہ پر علوم قدیمہ کی روش کیوں کر بدل سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج قوم میں غزالی و رازی، موجود نہیں لیکن ان کی تصنیفات آج بھی موجود ہیں اور وہ ہمارے لئے چراغ راہ بن سکتی ہیں۔ ان کی روشنی میں ہم اس قدر معلوم کر سکتے ہیں کہ نئے راستہ میں کیوں کر قدم اٹھانا چاہیئے اور قدیم و جدید راہیں کہاں جا کر مل جائیں گی۔"

ان موضوعات ابتدائی کے بعد مولانا کے خیال میں ان کاموں کی تفصیل جو اس زمانہ میں اسلاف کے نمونے پر کئے جا سکتے ہیں، حسب ذیل ہوگی۔

(۱) فلسفہ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ ملکی زبان میں لایا جائے۔

(۲) یہ بتایا جائے کہ فلسفۂ حال کے کون کون سے مسائل مذہب کے خلاف ہیں پھر ان مسائل کو یا رد کیا جائے یا مذہب سے تطبیق دی جائے۔

(۳) جس قسم کے مضامین پر آج کل یورپ میں تصنیفات ہو رہی ہیں اور جن پر اسلامی تصنیفات بھی موجود ہیں ان میں موازنہ کر کے بتایا جائے کہ مسلمانوں کا طرز تصنیف کیا تھا اور یورپ کا طرز تصنیف کیا ہے۔ مثلاً تاریخ، اسماء الرجال، معانی و بلاغت، تحقیقات مذہب میں عربی زبان میں کثرت سے تصنیفات موجود ہیں، انہی مضامین نے یورپ میں نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، موازنہ کر کے بتانا چاہیئے کہ دونوں کی مختلف خصوصیات کیا ہیں اور کس کو کس حیثیت سے ترجیح ہے۔

(۴) خالص اسلامی علوم مثلاً کلام، فقہ، اصول، تفسیر وغیرہ کی تاریخ اور ان پر ریویو لکھا جائے یعنی یہ علوم کب پیدا ہوئے کیوں کر بڑھے کس کس زمانہ میں کیا کیا باتیں ان پر اضافہ ہوتی گئیں اور کن اسباب

سے ہوئیں، ان کا کس قدر حصہ صحیح ہے، کس قدر تنقید اور اصلاح کا محتاج ہے۔

(۵) فارسی اور عربی شاعری اور انشا پردازی کی تاریخ لکھی جائے۔

(۶) جن نئے عنوانوں پر یورپ میں مضامین لکھے جا رہے ہیں، اردو زبان میں ترجمہ کے ذریعہ سے لائے جائیں۔

(۷) مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر تاریخانہ مضامین لکھے جائیں۔ مثلاً انتظام عدالت، انتظام محاصل، پبلک ورکس، تعلیمات، تجارت فوجی نظم و نسق، معاشرت غرض اس قسم کے تمام امور کی نسبت مورخانہ طور پر لکھا جائے کہ مسلمانوں نے ان چیزوں میں کہاں تک ترقی کی اور کس کس عہد میں کیا اضافہ ہوا۔"

ظاہر ہے کہ یہ مقاصد جو دکھائے گئے ہیں ان کی تکمیل ایک دو شخص کا کام نہیں بلکہ ایک مجمع العلماء کا کام تھا لیکن مولانا اپنی زندگی میں جو کچھ کر سکے۔ اس کو پھیلانا اور تفصیل سے دکھانا "دارالمصنفین" کا کام ہے۔ ہمارے سبک مقاصد کے لئے صرف اتنی ہی ضرورت تھی کہ اس جامع الحیثیات مصنف کی دماغی وسعت کا ایک سرسری خاکہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو اور بھولا ہوا سبق یاد آجائے۔

ہم کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ پرستاران شبلی مولانا کو غزالی اور شاہ ولی اللہ سے کم نہیں سمجھتے لیکن منحرف طبائع کو معلوم نہیں کہ آج کل کے دور مادیت میں کسی عظمت کے لئے محض خوش عقیدتی کافی نہیں، فوقیت کا راز ان دماغی تصرفات میں ہے جو صرف حکمائے ادب کا حصہ ہوتے ہیں۔ ہم ان صاحبوں کو ایک حد تک "غیر مکلف" سمجھنے کے لئے تیار ہیں، جن کے نظام عصبی کا مستقر سرے سے ان مسائل کے ادراک کی قابلیت نہیں رکھتا یا جن کی نفسیت غیر شاعرہ ہمارے زاویۂ نگاہ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ قوم

سخت بدنصیب ہے جو اپنے مصنفین کے (جو صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں) نتائج افکار پر فخر نہیں کر سکتی، ہم شبلی کو صرف اس لئے چاہتے ہیں کہ وہ خالص ادیب تھے اور اپنے اونچے معیار تصنیف کے لحاظ سے متاخرین ادب میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں تھے یعنی ان کی عظمت جو کچھ ہے ان کی ادبی اور تاریخی تصنیفات کی بنا پر ہے۔

بہرحال ہم کو اس شریفانہ جذبہ کے لئے جہاں تک لٹریچر کی تحسین شناسانہ کا تعلق ہے، معذرت کی ضرورت نہیں ہے اور ہم بلا خوف تردید مولانا کے وسیع ذخیرۂ ادب سے صرف "شعر العجم" کو لیتے ہیں جو تقریباً (ہائر کریٹی سزم) کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے، جس پر دنیا کی کوئی زبان ناز کر سکتی ہے۔ یہی کتاب ہے جو "خیام کلب" کی طرح ہماری سوسائٹی کو ایک متحد الغایۃ نظام کے تحت میں لا سکتی ہے، جس طرح "فٹز جیرلڈ" کی ملہمانہ شاعری نے خیام کو یورپ میں زندہ کر رکھا ہے اور آج خیام کے پرستاروں کا بہت بڑا حلقہ پیدا ہو گیا ہے، شعر العجم میں بھی بالخاصہ یہ کہربائیت موجود ہے کہ وہ کم سے کم تعلیم یافتہ طبقہ کے منتخب افراد کو ایک مرکز پر لا سکتی ہے۔ مجھ کو اصرار ہے کہ صرف اردو لٹریچر میں نہیں بلکہ مشرق کی کسی زبان میں اس پایہ کی تصنیف موجود نہیں ہے۔

فارسی زبان کی لائق ذکر خصوصیات ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس کا وسیع ذخیرۂ الفاظ، شستہ رفتہ طرز بیان اور ادائے خیال کی بہتری جدت آمیز نزاکتیں ہیں جن کی بنا پر آج بھی وہ زندہ زبانوں میں کسی سے پیچھے نہیں، ایسی لچکدار زبان کی شاعری جو جذبات انسانی کی برانگیختہ کرنے والی ہو اور جس میں خود نفس انسانی مخاطب صحیح ہو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا پایہ رکھتی ہے، نثر کو اگر "ضروریات" زندگی میں رکھئے تو شاعری اپنی ادائے خاص کے مابہ الامتیاز کی رو سے ان "تکلفات" کا نام ہے جن سے کوئی شائستہ اور متمدن قوم قطع نظر نہیں کر سکتی۔ بہرحال "شعر العجم" دنیا کی سب سے شیریں زبان کے جذباتی لٹریچر کا

ایک مرقع ہے جس میں مصور فطرت شبلی نے اس طبقہ کو زندہ کیا ہے جو مرنے کے بعد بھی غیر فانی ہونے کا مستحق تھا اور ہم ایسے شخص کی یادگار میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

شعر العجم کا چوتھا حصہ جس میں مولانا نے شاعری پر عام تنقید کی ہے، پوری کتاب کا روح رواں ہے۔ مولانا کے کمال انشا پردازی اور سخن آفرینی کا یہ حصہ اصلی جولانگاہ ہے جس میں انھوں نے اپنا زور قلم دکھایا ہے۔ فردوسی[1] پر جس طرح نظر ڈالی ہے اس کے کمال کی باریکیاں جس جس طرح ابھار کر دکھائی ہیں سچ یہ ہے کہ اس سے پہلے ادھر ذہن بھی منتقل نہیں ہو سکتا تھا اور یہی نکتہ سنجی کی آخری حد ہے جس میں وہ اپنے معاصرین سے علانیہ ممتاز نظر آتے ہیں لیکن یہ حصہ صرف مثنوی پر ختم ہو گیا ہے۔ بقیہ اصناف شاعری یعنی تشبیب، غزل، قصائد و رباعیات وغیرہ کے سلسلہ میں مولانا نے عشقیہ، صوفیانہ اور فلسفیانہ شاعری کے مستقل عنوانوں سے داد سخن دی ہے۔ جو حضرات لٹریچر کا مذاق صحیح رکھتے ہیں وہ اس حصہ کی "عطریات" کا اندازہ کر سکیں گے۔ میں ان اجزا کو اس قدر اہم سمجھتا ہوں کہ کتابی سلسلہ سے علیحدہ جہاں تک شاعری کی ماہیت نفسی (سائیکالوجی) کا تعلق ہے دونوں حصے بجائے خود ایک مستقل چیز ہیں، لیکن افسوس ہے کہ پانچواں حصہ جس کا مسودہ موجود ہے، اس وقت تک پریس میں نہ جا سکا۔

---

[1] فردوسی کو اپنے کمال کی داد زندگی میں نہ مل سکی، لیکن مولانا نے جس طرح اس کی تلافی کی ہے۔ اچھے اچھے اہل قلم کو اس پر رشک آئے گا۔ پروفیسر براؤن بھی جو طبقہ اعلیٰ کے لکھنے والوں میں ہیں، تحقیق کے ساتھ مذاق سخن کہاں سے لاتے۔ ان کی تاریخ الادب اس حیثیت سے بہت پھیکی ہے۔

بہت کم لوگ ہیں جنھوں نے شعر العجم پڑھنے کی تکلیف گوارا کی ہوگی، ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جن کو شاید یہ علم ہو کہ شبلی کی آخری تصنیف کا سب سے آخری حصہ ہے[1]، اس وقت تک شائع نہ ہو سکا اور ایسا تو ایک بھی نہیں ہے جسے اس کی اشاعت کی ضرورت کا احساس ہو "معارف" کا خیال ہے کہ طبقۂ متوسط میں فرض شناسی کا احساس پیدا ہو گیا ہے لیکن امرا میں نہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے اس سے اتفاق رائے ممکن ہو تو علمی دنیا کے لئے یہ بالکل نیا اکتشاف ہوگا۔ جہاں تک اردو انشا پردازی کے مذاق کا تعلق ہے کوئی روح عامہ موجود نہیں ہے، دو چار کام جو ہو رہے ہیں وہ محض اس لئے کہ ان میں امرا کا "طلائی ہاتھ" ایک حد تک شریک ہے، لیکن یہ فیاضی بھی اضطراری ہے، احساس نہیں۔

مختصر یہ کہ پانچواں حصہ نہایت دلچسپ ہے، اس میں صوفیانہ شاعری کی ارتقائی حالت کے سوا عشقیہ شاعری کے تفصیلی ریویو میں عرب اور عجم کے جذبات کے دقیق امتیازات دکھائے گئے ہیں۔ جس کا ایک حصہ "معارف" میں نکل چکا ہے، ناظرین آنکھ اٹھا کر ایک نظر دیکھ لیں۔ یہ نفاست خیال، یہ خوش بیانی اب کہاں؟

"اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"

اس کی اشاعت شبلی "سوسائٹی" کے فرائض میں سر فہرست ہونی چاہیئے ورنہ فارسی شاعری کی انسائیکلوپیڈیا ناتمام رہ جائے گی۔

مولانا کے مضامین یعنی "مقالات شبلی" پر بھی ایک نگاہ ڈالنی ہوگی، جس کی ترتیب میرا خیال ہے نظر ثانی چاہتی ہے، جہاں تک میں استقصار کر سکا کم و بیش ۳۶ مضامین اور ہیں جن سے مقالات کی دوسری جلد تیار ہو سکتی ہے۔ ان چھوٹے

---

[1] تین سال سے کتاب پڑی ہوئی ہے، اس کے طبع کرنے میں زیادہ سے زیادہ ۳۰ روپے صرف ہوں گے، کیا شبلی "سوسائٹی" میں ۳۰ ارکان بھی ایسے نہیں مل سکتے ہیں جو دس دس روپیہ اس کے لئے جیب سے نکال سکیں۔ مہدی

چھوٹے خطہ ہائے سخن ہیں بعض مستقل رسالہ کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً فلسفۂ یونان و اسلام[1] جن کے متعدد نمبر ہیں۔

تاریخ کا یہ ایک اہم سوال ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور میں فلسفہ و سائنس پر کچھ اضافہ و ترمیم کی یا نہیں یا جیسا بارہا کہا گیا "وہ ارسطو کی گاڑی کے صرف قلی تھے"۔ یورپ کے جن مستشرقین کا فیصلہ ہمارے حق میں ہے وہ بھی اس لحاظ سے چنداں وقیع نہیں کہ یہ فیصلہ اجتہادی نہیں بلکہ عربی فلسفہ کی سرسری واقفیت پر مبنی ہے، بلکہ مولانا نے دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے فلسفہ یونان کو کس حالت میں پایا، ان میں کیا کیا تصرفات کئے، اسی طرح "فلسفۂ اسلام" میں علوم قدیمہ و جدیدہ سے بحث کی گئی ہے یعنی یونانیوں کا فلسفہ کیا تھا، فلسفۂ حال کیا ہے؟ مسلمانوں کے فلسفہ کو دونوں فلسفوں سے کیا نسبت ہے؟ یہ معرکۃ الآرا سلسلہ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ناتمام رہا۔ ابن رشد کا مضمون بھی نہایت ضروری ہے جس کے فلسفہ پر یورپ مدتوں جیتوں رہا، گو مولانا اس کی تصنیفات اور اجتہادات پر ریویو نہ کر سکے۔ "شعر العرب" کے چار نمبر، شعر العجم کے مقابلہ میں ہماری قابل افسوس ناداری کے لحاظ سے پھر بھی غنیمت ہیں۔

ایک کام جو دراصل شبلی سوسائٹی کے کرنے کا تھا۔ اس کی اولیت دارالمصنفین کے حصہ میں رہی۔ میری غرض مکاتیب شبلی کی دو جلدوں سے ہے جو مولانا سید سلیمان ندوی کی تہذیب (ایڈیٹری) میں نہایت نفاست سے

---

[1] فلسفہ یونان و اسلام نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵
(۲) فلسفۂ اسلام نمبر ۱، ۲
(۳) الاسلام نمبر ۱، ۲، ۳
(۴) ابن رشد نمبر ۱، ۲، ۳
(۵) شعر العرب نمبر ۱، ۲، ۳، ۴

الغایۃ ۴، ایک ہی خاندان کی شاخیں ہیں جن سے ایک مستقل رسالہ تیار ہو سکتا ہے، اگر رسائل شبلی اور مقالات کے مضامین یکجا کر دیئے جائیں اور "عالمگیر" کا مضمون بھی شامل کر لیا جائے تو دو نہایت ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔

شائع ہوئیں، عہد جدید میں کوئی مثال ایسی نہیں ہے جس میں کسی مصنف کے نجی خطوط جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہو اور جس کے اجزا چھ سو صفحوں پر پھیلے ہوں۔ جس طرح آج کل خوش لباسی کی شرط یہ ہے کہ اس میں کم سے کم پیداکردہ بے ساختہ پن[1] ہو یعنی کہیں سے اہتمام نہ پایا جائے۔ لٹریچر کا وہ حصہ بہت دلچسپ ہوتا ہے جس میں آمد سخن یعنی برجستہ ادائے خیال کی حیثیت سے تکلف مقصود و اہتمام کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ یہ بات صرف پرائیویٹ تحریرات میں ہو سکتی ہے جس کا وقتی اظہار مافی الضمیر کے سوا یہ نہیں ہوتا کہ وہ گھونگھٹ سے باہر آئیں۔ لکھنے والے کو بالکل خبر نہیں ہوتی لیکن اس کی سرسری جنبش قلم غیر ارادی طور پر اس کا روزنامچۂ زندگی مرتب کرتی جاتی ہے جس میں اس کے اصلی جذبات و احساسات کے خط و خال دیکھ لیجئے۔ یہ بھی ایک طرح کی مرقع نگاری ہے جس میں نزاکت یہ ہے کہ انشا پرداز اپنی تصویر خود اپنے قلم سے کھینچتا ہے۔

ایک دوست کی جو مغربیات کا نہایت صحیح مذاق رکھتے ہیں، خواہش تھی کہ اس مجموعہ کی ترتیب تاریخی حیثیت سے ہوتی تھی لیکن یہ اس لئے نہیں ہو سکا کہ مواد ترکیبی ایک وقت میں پیش نظر نہیں تھا، مدتوں ان بکھرے ہوئے موتیوں کے لئے لائق ایڈیٹر کو جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑی۔ اس کے سوا مختلف اشخاص سے مولانا کے روابط کی نوعیت بھی جداگانہ تھی، کسی ایک سلسلہ یا موضوع خاص کی تحریریں تاریخی ترتیب سے "خواب پریشان" کی طرح منتشر ہو جاتیں جس سے وہ موزونیت جو اب ہے باقی نہیں رہ سکتی تھی، بہرحال اردو لٹریچر میں میرا خیال ہے، یہ ایک قیمتی اضافہ ہے اور چونکہ مولانا کی تصنیفات کی طرح ان میں بھی "انشا پردازانہ فصاحت و بلاغت" موجود ہے، اس لئے دارالمصنفین کے "خوان ادب" کا یہ وہ لطیف حصہ ہے جسے آپ لائٹ لٹریچر کہہ سکتے ہیں، اس میں ابھی بہت

---

[1] Studied Negligence

کچھ اضافہ کی گنجائش ہے اور ہم امید کرتے ہیں ہماری سوسائٹی تیسری جلد کے سامان کی فراہمی میں کافی دلچسپی کا اظہار کرے گی۔

اسی سلسلہ میں ایک اضافی کام اور ہمارے کرنے کے لائق ہے یعنی ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے شبلی کی یادگار میں ہم کو خیام کی رباعیات کا ایک نفیس اڈیشن شائع کرنا ہے، ہم کو "خواجہ حافظ" کے ساتھ بڑھی ہوئی حسن عقیدت کے مقابلہ میں غریب خیام کے وجوہِ حق تلفی پر غور کرنا ہوگا۔ مشرقی اقوام نے مذہب سے علیحدہ ہو کر کبھی زندگی پر نظر نہیں ڈالی۔ خیام کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے صرف اس حصہ سے غرض رکھتا ہے جو "از گہوارہ تا گور" سے آگے نہیں بڑھتی، کیا یہ الحاد ہے؟ قطعاً نہیں! مذہبی مذاق بالخاصہ موجودہ زندگی کو اگرچہ حرف غلط نہیں سمجھتا تھا تاہم اس کا میلان طبعی یہ ہے کہ اصلی زندگی کا آغاز قبر کے اس سانچے میں ڈھلنے کے بعد ہوتا ہے، لیکن خیام جو کچھ سامنے ہے یعنی مادی زندگی سے قطع نظر کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا دائرۂ موضوع ہستی، موجودہ یعنی نقد ہے۔ ادھار نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ اپیکورین فلسفہ کی کورانہ تلقین یعنی صرف ایک طرح کی خوش عیشی سکھاتا ہے۔ اخلاقی تعلیم کی بڑی سے بڑی غایت یہ ہے کہ وقتِ موجودہ سے جہاں تک ممکن ہے جائز استفادہ کا کوئی پہلو رہ نہ جائے۔ خیام بھی یہی کہتا ہے کہ "کل" جو گذر گئی، بیکار سی چیز ہے، جو آئے گی، وہ غیر اختیاری ہے۔ زندگی آج صرف آج کا نام ہے۔

ایشیا نے خیام کے ساتھ افراط سنجیدگی سے ہمیشہ بے اعتنائی کی بیچارہ یورپ کے ہاتھوں جی رہا ہے۔ ہم کو اس سرد مہری کی تلاش کرنی ہے۔ سب سے پہلے فٹز جیرلڈ کی نظم کو اردو میں لینا ہوگا۔ ہمارے پاس کافی مواد موجود ہے، جس سے ہم یہ بتلانے کے لائق ہوں گے کہ اس کے خیالات کا ماخذ کیا ہے یعنی خیام کے سوا اس نے اپنے سلسلۂ خیال میں اور کس کس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اصلی کام یہ ہوگا کہ خیام کا آکسفورڈ اڈیشن جو غالباً سب سے قدیم نسخہ ہے اور جس

میں رباعیات کا فوٹو لیا گیا ہے اردو ترجمے اور حواشی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس اشاعت کی امتیازی خصوصیت یہ ہوگی کہ خیام کے فلسفۂ زندگی پر، سوسائٹی کے "عام نفسیات" کا تفصیلی ریویو ہوگا اور کیا تعجب ہے اس سلسلہ میں ہم اس پر بھی غور کر سکیں کہ خیام کی شراب انگوری کھینچ کھینچا کر شراب معرفت کیوں کر بنی؟ اس پہلو سے ہم تصوف کے ان مسائل پر ایک نظر ڈال سکیں گے جو براہِ راست علم النفس کی زد پر ہیں اور کچھ نہ کچھ اس راز کی عقدہ کشائی ہو سکے گی، جس کی وسیع الکیفی کی لائق رشک خصوصیت یہ ہے۔

"منکر مے بودن وہم رنگ مستان زیستن"

سب سے آخر مگر دراصل کسی سے پیچھے نہیں، مولانا کی فارسی اور اردو نظم کو یکجا کرنا ہے جو بہ اوقات مختلف ٹکڑے، پارچے ہو کر چھپتی رہیں۔ بہت سی پھول پتیاں ہیں جن کے اجزائے پریشاں بکھرے ہوئے ہیں اور جن میں کوئی ہیئت مجموعی نہیں۔ کسی نازنین کی زلف عنبریں جو شانوں پر بکھرتی ہوئی حسن انتشار کے ساتھ کمر سے نیچے جا پڑی ہو، کیفیت سے خالی نہیں ہوتی۔ لیکن "گرہ شب"[1] یعنی جوڑے کی بندش اس سے زیادہ دلکش اور خوش ترکیب ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اوراق منتشر کا ایک گلدستہ بنایا جائے۔

بمبئی کی نازک خیالیاں گویا میری جوانی کے قصے ہیں جو مولانا کی زبان سے ادا ہوئے۔ آپ داد دیں یا نہ دیں، شاعر کو بالکل اس کا احساس نہیں۔ اس کا عالم خیال خود ایک دنیا ہے۔ ذرا جذبات کا تموج دیکھئے گا، سمندر کے کف سے ایک پری[2] نکلی، لیکن بالکل عریاں، جس کے بالوں سے قطرات آب موتی کی طرح ٹپک

---

[1] بہم کردہ موئے بصد پیچ و تاب گرہ داد شب را بسر آفتاب

[2] "مصنف کی وادیہ" خیال ایک نہایت حسین مرقع کے ذریعہ سے ادا کیا گیا ہے جس میں مغربی آرٹسٹ نے اپنا کمال فن دکھلایا ہے۔ مہدی

رہے ہیں، اس کے نازک سے ہاتھ میں ایک ساغر شراب ہے، وہ شاعر کی طرف بڑھتی ہے، عنبر بکھیرتی ہوئی، یاقوتی ہونٹھوں پر ایک معنی خیز تبسم ہے۔ نازک خیالی جس کی بلائیں لے رہی ہے۔ ذرا شاعر کی کافرادائی دیکھئے شراب کبھی منھ سے نہیں لگی صرف زبان پر چڑھتی تھی، لیکن اس نے چھلکتا ہوا جام دفعتاً خالی کر دیا،

چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

کہیں یہ "آب حیات" تو نہیں تھا؟

بہرحال جس نازک خیال اور نفیس المذاق نے عجم کی شاعری کو اپنے زور قلم سے زندہ کیا ہو، اس کے کلام کی ترتیب کم ضروری نہیں یعنی کلیات شبلی کے ایک خوبصورت اڈیشن کی اشاعت ناگزیر سی ہے۔ اس میں وہ اخلاقی اور سیاسی نظمیں بھی ہوں گی "جو کشافیات" کے پردہ میں "الہلال" میں وقتاً فوقتاً نکلتی رہیں۔ یہ ترتیب تاریخی حیثیت کی ہوگی۔ جس سے مولانا کی شاعری کی تدریجی رفتار اور اس کے ارتقائے نفسی کا اندازہ ہو سکے گا۔

یہ خیالات جن کے اظہار میں جلدی کر رہا ہوں "شبلی سوسائٹی" کے دائرہ مقاصد سے باہر نہیں ہیں لیکن ابھی اصل مسئلہ کی طرف توجہ کرنی ہے۔ میری غرض ان تحریکات سے ہے جن سے کسی طرح تعلیم یافتہ طبقہ اردو کا شیدائی بنایا جا سکے۔ تصنیف و تالیف کی چنداں فکر نہیں کہ نہیں نہیں پر بھی کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ "انجمن اردو" نے بعض لاجواب اور قیمتی کتابیں شائع کیں اور اس کا آئندہ نظام عمل (پروگرام) بھی وسیع لائنوں پر ہے۔ "دارالمصنفین" بھی اپنا درجہ قائم رکھتا جانتا ہے اور خواص کی پھانس کے لئے "لقمہ ماہی" تیار رکھتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ان اوسوں پیاس کا بجھنا آسان نہیں۔ یعنی ہماری علمی تشنگی کے لحاظ سے۔ برف میں لگی ہوئی چند بوتلیں کافی نہیں تھیں۔ مگر اب کہ "ہز رائل ہائنس فرماں روائے دکن" [1]

[1] آمد سخن کا ایک اضطراری تصرف ہے لیکن اگر رائلٹی یورپ کی اودی اودی رگوں بقیہ صفحہ ۷۶ پر

سایۂ عاطفت میں "عثمانیہ یونیورسٹی" قائم ہو رہی ہے، اردو کا دائرہ بہت بڑھ جائے گا۔ یہ فیاضانہ اسکیم "سرخ فیتے" یعنی جن کے ہاتھوں میں انتظام ہے آشنائے فن ہو کر خوش سلیقگی سے چلا سکے تو باوصف اس کے کہ ابتداً ایک مقامی تحریک ہوگی، اردو کی وسیع قلم رو میں اس کا اثر برق رَو کی طرح دوڑ جائے گا اور یہ ایک ایسا چشمۂ جاریہ ہوگا جس کی شاخیں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوں گی۔ بشرطیکہ ہم وقت سے فائدہ اٹھا سکے اور اس وسیع الاثر تجویز کے نتائج کو متفقہ کوشش سے وقف عام کر سکے۔

آج ہم میں بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ صرف خوش وضعی (فیشن) پر جان دیتا ہے، اس کا لباس متمدنہ (کوٹ پتلون)، اس کی امتیازی زندگی کا ایک ایسا مظہر ہے جس سے وہ باوصف کم استطاعتی قطع نظر نہیں کر سکتا۔ اس کی لطافت خیال نئی وضع کے دہرے کالر میں ریشمی ٹائی کی چبھتی ہوئی نشست سے آگے نہیں بڑھتی۔ گلے کی اس "بندش" کا تلازمہ اگر کہیں ہم رنگ موزے اور رومال سے ہو گیا۔ پھر تو اس کے تخیل کی تکمیل کے لئے موجودہ دنیا میں کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں رہتی۔ آپ یہ نہ سمجھیں میں اس خوش لباس حیوان ناطق کو اول درجہ کے معیار سے گرا کر آدم کی ابتدائی پوشش پر لانا چاہتا ہوں، میری غرض صرف یہ ہے کہ یہ طبقہ جس طرح ظاہری ٹھاٹھ کا گرویدہ ہے، دماغی آرائش بھی اس کا مطمح نظر ہوتی اور یہ اردو لٹریچر سے اتنا مانوس ہو سکتا کہ ادبی رنگ رچ کر نکھر جاتا جس سے قوم دنیا میں آبرودار ہو کر رہتی۔

لہ بقیہ صفحہ ۵، کا۔ کی روانی خون کے ساتھ مخصوص نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ مشرق کے سب سے بڑے شہزادے کے لئے جو اپنے وسیع ذرائع مالی و اقتصادی کے ساتھ اپنے لائق رشک سن و سال کے لحاظ سے دنیا کے بہتیرے تاجداروں سے کم نہیں ہے ہم "شاہی" انتساب کو کیوں نہ جائز رکھیں۔ مہدی

آج ہماری سیاسیات کی جو کچھ حالت ہے ظاہر ہے۔ ہماری "اقلیت" انتشار ذرات کی حیثیت سے قوی تر عناصر میں بتدریج جذب ہوتی جاتی ہے اور ہم ظاہرا بہت کچھ ابھرتے نظر نہیں آتے۔ بیشک جو مطالبے گورنمنٹ سے کئے جاتے ہیں وہ ملک کے قدرتی حقوق ہیں، لیکن جب تک فاتح و مفتوح کی زبان و مذہب اور قومیت ایک نہ ہو، گورنمنٹ کے فرد عمل (پالیسی) میں ہمارے جذبات کی کہاں تک رعایت ہو سکتی ہے۔ لیکن خیر اس کی مشکلات سے قطع نظر کر لیجئے کیا اس بدنصیب برِاعظم میں سیاسی مصالح کی بنا پر بھی کوئی متحدہ قومیت کی روح موجود ہے یا کبھی ہو سکتی ہے!

مسلمانوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ آئے تھے حکومت کرنے لیکن اس طرح جم کر رہ پڑے جیسے کوئی خانہ برباد پردیس میں اگر بات بن گئی تو رئیس بن جاتا ہے۔ اس غلطی کی تلافی تو اب ہو چکی لیکن سوال یہ ہے کہ سات کروڑ اشرف الموجودات جن میں کوئی ہیئت مجموعی نہیں ہمارے کس کام کے ہیں؟ ہندوستان کی اصلی قوم ہم کو اضافی اور خارجی عنصر سمجھتی ہے۔ غیر جگہ ہمارے پھیل پڑنے سے یہی نہیں ہوا کہ ہم نے اپنی اصلیت اور یکرنگی کھوئی، بلکہ اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبے جن کا یہ اصلی وطن تھا اور جو ان کی مختص النوع اغراض کے لحاظ سے دراصل ان کے لئے خلاصہ دنیا تھا۔

آج آپ ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے اپنی گذشتہ روایات (؟) کی بنا پر خاص خاص مراعات چاہتے ہیں لیکن اگر اصلی قوم میں گھل مل بھی جائیے یعنی خوش ذائقہ "بریانی" سے دستکش ہو کر "کچی رسوئی" پر آ رہیے تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہونا ہے کہ شرکت کی بانڈی چوراہے میں! بہر حال فضائے امید کسی رخ سے دیکھئے خیر حوصلہ افزا ہے۔

لیکن اس دورِ حریت میں اگر آپ اپنا ادب (لٹریچر) بھی کھو بیٹھے تو تاریخ آگے چل کر آنکھیں دکھائے گی کہ ترقی تو خیر جس نقطہ پر ہم کو اپنی روایات سابقہ

کی بنا پر قائم رہنا تھا وہاں بھی نہ ٹھہر سکے۔ آج کی جنگی اصلاح میں ادبی حیثیت سے ہماری یہ شاندار پسپائی آئندہ دنیا کے لئے واقعہ عبرت ہوگی

کس قدر غیر منطقی خیال ہے کہ ہم برادران وطن سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اردو کو ہماری طرح اوڑھنا بچھونا بنائیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ کوئی قوم اس وقت تک اپنے لئے "مستقبل" نہیں پیدا کر سکتی جب تک اس کی ابتدائی رفتار کی بنائے اساسی منازل ارتقائی کے سلسلہ میں اس کی گذشتہ عظمت پر نہ رکھی گئی ہو۔ یہی گذشتہ عظمت ہے جو کسی قوم میں ہیئت مجموعی پیدا کر سکتی ہے۔ ہندی کے قومی زبان کے بنانے کا راز یہی ہے جو بھولے مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ خوب یاد رکھئے ہندی مسئلہ کی تجدید چند تاریک خیال دیہاتیوں کے مخروطی دماغ کی جدت آمیز اختراع نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہندو بھی اس زبان سے دست بردار نہیں ہوگا جس کو وہ اپنی قوم کی اسپرنٹو[1] دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے۔ جس کے گرد اس کی متحدہ قومیت کے تمام مفردات ایک ایک کر کے حلقہ زن ہونگے۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ فریمسنوں کا ایک راز ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہا ہے اور پاس کے پاس ہم کو خبر نہیں ہوتی۔ ہندی[2] کی دبے پانوں مگر نہایت مستقل ترقی دراصل اردو کے گلے کی چھری ہے جو ایک دن اس کا خون کر کے رہے گی۔ حکومت بھی رنگ غالب کا ساتھ دے گی، اس لئے میں عرض کئے دیتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کی یہی غفلت رہی تو زیادہ نہیں پچاس برس

---

[1] ESPERANTO یعنی ایک مصنوعی بین الاقوامی زبان جس کا تصور ۱۸۸۷ء میں ڈاکٹر زیمنوف (L. L. ZEMENOF) نے پیش کیا تھا۔ مرتب

[2] میں یہ لکھ رہا ہوں کہ دفعتاً "ہندی لٹریری کانفرنس" کی خبر آئی جس کی پہلی نشست میں صرف ایک رئیس نے دس ہزار دے دیئے۔ مقاصد کے لحاظ سے اسے ناگری پرچارنی سبھا کا تخت رواں سمجھئے۔ مہندی

کے بعد آپ جانتے ہیں کیا ہوگا؟ اردو کا وہی رنگ ہوگا جس کا ایک دھندلا سا خاکہ حال میں "ہمدم" کے لائق اڈیٹر نے پیش کیا تھا۔ کفر وہ بھی کعبہ میں! لکھنؤ اردو کا گہوارہ طفلی نہیں بلکہ اس کا عشرت کدۂ شباب رہا ہے لیکن وقت کی بات ہے جس چیز پر ہم کو ناز تھا جو ہمارے لئے گرمیٔ محفل کے سامانوں میں نہیں بلکہ شرطِ زندگی تھی، آج سرے سے اس کا وجود ہی معرضِ خطر میں ہے۔ اگر ہندی نے رفتہ رفتہ ہاتھ پاؤں نکالے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے وضعدار بیویوں میں بڑے پائنچوں کی جگہ جو خوش ادائی سے کھونسے جاتے ..... ہیں، گاڑھے گزی کی ساریوں کو رواج دیا جائے، جسے دیہات کی کثیف عورتیں نصف ساق تک لپیٹ لیتی ہیں۔

منھ پر آئی ہوئی بات رکتی نہیں، اور میں سلسلۂ گفتگو میں آپ سے جانے کیا کیا کہنا چاہتا ہوں، خاص کر اس خیال سے کہ جہاں آواز کی رسائی نہیں، تحریر مقاصدِ دلی کی وکیل بن سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ یارانِ وطن نے اردو کو لنگوئی بندھوا دی ہوتی۔ لیکن کثرتِ یاس کبھی امید کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ دفعتاً واقعات نے کروٹ لی اور اردو جو کل تک کس مپرسی کی حالت میں تھی آج شاہی دائرہ نظر میں ہے، جھونپڑوں کی رہنے والی اور محلوں کے خواب! بات بنتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اس غیر متوقع اعزاز کے ساتھ اس کی آبرو کا نباہ جیسا بارہا کہہ چکا ہوں ہمارے نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی چلتی ہوئی تدبیر یہ ہے کہ جدید تالیفات کے سوا جو پڑھنے کے لائق ہوں، حکمائے ادب کی تصنیفات ایک ایک کر کے پیشِ نظر رکھئے، جس طرح صوفیہ کو تزکیۂ نفس کے لئے ریاضاتِ شاقہ کے سلسلہ میں بہتیرے "مقامات" طے کرنے پڑتے ہیں، آپ کے وظائفِ عمل کے لئے "عناصرِ خمسہ"[1] کے انچھروں پر نظر کا ایک دفع جما لینا کافی ہوگا۔ اسی لئے سب سے پہلے آپ کو "فلسفۂ عشق" یعنی "شعر العجم" کی چاٹ پر لگانا چاہتا ہوں

---

[1] میری غرض آزاد، سرسید، نذیر احمد اور حالی و شبلی کی تصنیفات سے ہے (صفحہ ۸۰ پر)

یہ تو فرائض ہوئے نوافل میں معارف" کا ورد ماہوار ناگزیر سا ہے اور یہ شبلی سوسائٹی کی سب سے پہلی اور ضروری خصوصیت ہوگی۔

آج کل کے دور سرفروشی میں کیا سات کروڑ میں سات لاکھ نہیں سات ہزار نہیں، سات سو رضا کار فدایان سخن بھی نہیں مل سکتے جن کی زندگی کا بہترین تخیل "معشوقۂ ادب" کی پرستش کے سوا کچھ نہیں، جس کا حسن افسردہ سفارشی ہے کہ بے التفاتی کی جگہ گرمجوشی سے پیش آیئے۔ یہ جہاں چاہنے والے کے گلے کا ہار بننے کو تیار ہے، ہر شخص کے قابو میں آنے والی چیز نہیں۔ اس پاکیزہ وشی کے ساتھ جدت یہ ہے کہ بوڑھی ہونے والی نہیں یعنی شراب کی طرح کہ جتنی پرانی ہو باکیف ہوتی ہے۔ اسے بہار بے خزاں سمجھئے، اس سے زیادہ آپ کے جذبات کی رعایت کیا ہوگی۔

کل کی بات ہے، مسلمان اپنے ادب (لٹریچر) کے سبب سے زیادہ دلدادہ تھے، یہ جذبۂ متوارث آپ نے کہاں کھویا! کیا یہ آپ کی عزت نفس پر حرف لانے والی بات نہیں کہ انجمن ترقی اردو اور دارالمصنفین کی ٹکسالی (اسٹینڈرڈ) تصنیفات کی دو چار سو جلدیں بھی سال میں نہیں نکل سکتیں اور گرد خوردہ اوراق الماریوں کی چھاتی کا لوجھ رہتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں آپ کوئی قوم دکھا سکتے ہیں جس نے مانگے تانگے کی نہیں اپنی مادری زبان سے بے نیاز رہ کر کبھی ترقی کی ہو۔ ترقی تو مجھے کہنا چاہیئے دنیا میں باقی رہی ہو۔ ان نکات کو آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ضرورت جو کچھ ہے یہ ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھئے، وقت کا فتویٰ کیا ہے خیر ضائعات کی تلافی گو آسان نہیں لیکن تریاق غلط کاری کو آزما دیکھئے۔ اس گئی گذری حالت میں بھی اگر آپ دل پر رکھ لیں تو اپنی گذشتہ روایات کا زندہ کرنا بڑی بات نہیں۔

لہ بقیہ ۷۹ کا، متاخرین میں یہی ارواح قدسیہ ہیں جن کو موجودہ لٹریچر کی خلاقی میں جہاں تک طبقۂ اعلیٰ کا تعلق ہے۔ سب سے زیادہ دخل ہے۔ مہدی

ذوق علمی شراب کا سا چسکا ہے کہ ایک دفعہ جہاں منہ لگی پھر نہیں چھوٹتی، میں آپ کے لئے اسے حلال کئے دیتا ہوں۔ خود شوق کیجئے اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں اس مذاق کو چمکائیے۔ صرف شرط یہ ہے کہ ایک ہو کے رہیئے اور اس طرح اس مشغلہ کو چھیڑیئے کہ اغیار بھی کہہ اٹھیں۔

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

خیام کا شبلی اڈیشن جب شائع ہوگا، ہوگا، اس کے الفاظ یاد رکھئے کہ زندگی آج اور صرف آج کا نام ہے۔

شبلی سوسائٹی کے مقاصد کی باقاعدہ تفصیل، اس کا نظام ترکیبی اور وہ جزئیات جن سے خیام کلب، کی طرح ارکان سوسائٹی ادبی اخوت کی سلک ریشمی میں منسلک ہو سکیں، حیدرآباد، کی بزم ادب کے لائق افراد کا موضوع آئندہ ہوگی۔

حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک

جدت موضوع چاہتی تھی کہ جہاں تک ہماری آخری بزم کا تعلق ہے اس لپیٹ میں کوئی چھوٹنے نہ پائے، لیکن افسوس ہے مواد ترکیبی کی کمی نے زیادہ پھیلنے کا موقع نہ دیا اور گو "چشمک" کا دائرہ اطلاقی خالص حالی و شبلی کی شوخیٔ قلم سے آگے نہیں بڑھا لیکن ضمناً اوروں کا انداز طبیعت (کیرکٹر) بھی دکھاؤں گا اور بکھرے ہوئے موتیوں کو جہاں جہاں سے ہاتھ آئیں گے سلسلۂ بیان میں پروتا جاؤں گا۔

سرسید کی "بزم ادب" بچے کھچے پرانے لائق پرستش بزرگوں کا گویا نچوڑ تھی لیکن جس طرح خیمہ کے ساتھ طنابیں بھی اکھڑ جاتی ہیں، ان کے رفقا بھی ایک ایک کر کے آگے پیچھے ہم سے رخصت ہوتے گئے۔ ان کی نکتہ سنجیاں اور روشن خیالیاں، بوڑھے غمزے اور لطائف و ظرائف، قدیم اسلامی سوسائٹی کے تبرکات تھے جن سے ہم ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھے اور اب ان اصحاب کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے، جنھوں نے جما جمایا نقشہ یعنی پچھلے پہر کا خواب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ان میں ہر فرد اپنے اپنے دائرہ کا مالک تھا، اور مستقل ہستی رکھتا تھا آج "وقار الملک" اور "محسن الملک" کی یادگار میں چند سطریں بھی کوئی لکھنے والا نظر نہیں آتا، اور "رجال العصر" کے سلسلہ میں ان کی ضمنی کھپت ان کا بہترین

حق ہے جو ہمارے ہاتھوں ان کو مل سکتا ہے۔ میں یہاں ان دونوں لایق افراد کی زندگی کا وہ رخ دکھانا نہیں چاہتا جس کے لحاظ سے کبھی یہ سالار جنگ اعظم کے نفس ناطقہ بنے ہوئے تھے، نہ محسن الملک کے اس کارنامہ کو یاد دلانا چاہتا ہوں جب ان کے قیام لندن میں وزیر انگلستان کو اعتراف کرنا پڑا۔ کہ ہندوستان میں اتنا بڑا اعالی دماغ موجود ہے۔ اسی طرح دونوں صاحبوں کی سیاسی اور قومی خدمات بھی میرے موضوع کے لئے حیثیت اضافی رکھتی ہیں لیکن یہ بات بھولنے کے لایق نہیں ہے کہ جہاں تک سرسید کی ادبی تبلیغ کا تعلق ہے۔ یہ دونوں گویا ان کے دست و بازو تھے۔ سرسید کے ساتھ "محسن الملک" کی نوک جھونک ادبی راز و نیاز جس کا ایک خاکہ مراسلات دلچسپ میں دکھایا گیا ہے اور جس کے عالمانہ اور سخن گسترانہ شواہد "مرحوم تہذیب الاخلاق" کے سیزدہ سالہ فائل میں بہ کثرت ملیں گے، فتوحات ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔ جن پر مستقلاً اظہار خیال کی ضرورت ہے۔ میرے موضوع کے صفحات محدود ہیں، ان کے پھیلانے کی گنجائش نہیں، یہاں صرف چشم سخن کے اشارہ پر قناعت کرنی ہوگی۔

بہر حال کس کس کو یاد کروں، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، ذکاء اللہ نذیر احمد، حالی و شبلی وغیرہ وغیرہ، سجی سجائی محفل تھی جو دیکھتے دیکھتے درہم برہم ہوگئی۔ "سرسید کی بزم ادب" ایسا وسیع موضوع ہے کہ اگر مولوی وحید الدین سلیم نے اپنی عمر ضایع نہ کی ہوتی اور سرسید اور ان کے رفقاء کے ساتھ جو وابستگی ان کو رہی ہے اور جس کے "آثار معارف"[1] کے نقش اول میں بہ افراط موجود ہیں وہ افسانۂ یاران کہن کی حیثیت سے ایک ضخیم الاوراق اور نہایت دلچسپ کتاب تیار کر سکتے تھے، اگر یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کی اخلاقی فوقیت کا راز دراصل اس

---

[1] معارف، علی گڈھ کی طرف اشارہ ہے۔ مرتب

پاکیزہ سوسائٹی میں مضمر ہوتا ہے تو "سیر الصحابہ" کی طرح علی گڈھ کی یہ آخری بزم ادب ہمارے لئے وقت کی چیز اور نتیجہ خیز رہتی۔

خیر! ان تصریحات کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹیئے۔ سرسید نے ہمیشہ معاصرین ادب کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کی با اثر شخصیت خاموش تصرف کے ساتھ دوسروں کی قلب ماہیت کرتی رہتی تھی۔ شبلی نے "مولویت" علی گڈھ میں پہنچ کر چھوڑی ان کے خیالات کی کایا پلٹ، مذاق تصنیف اور وسیع النظری غرض یہ جو کچھ ہوئے، سرسید کے دامن تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا وہ آج بھی ان کی شرافت ادبی کا پتہ دیتا ہے۔ اسی طرح حالی کی نیچرل شاعری خیالات کے لحاظ سے سرسید کے فیض صحبت کی ممنون ہے۔ ابھی یہ فیصلہ باقی ہے کہ حالی کی روشِ جدید نے پروفیسر آزاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل یعنی ان کے نتائج فکر سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جن کو تاریخی حیثیت سے کم سے کم اولیت کا شرف حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ متاخرین ادب کے ساتھ سرسید کا درجۂ تناسبہ صرف مربیانہ تھا۔ اسی لئے ایسی باوقار ہستی سے چشمک تو خیر اس کی کسرات بھی بہ مشکل ہاتھ آئیں گی۔

پروفیسر آزاد اس قدر بلند خیال اور استادانہ دل و دماغ رکھتے تھے کہ ان کے ہاں بھی جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے "چشمک" کا گذر نہیں ایک واقعۂ دلچسپ اہل ذوق کی ضیافت طبع کے لئے لکھتا ہوں۔ لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے، گو دماغ کسی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ نذیر احمد ملنے کے لئے گئے، حالی اور غالباً شبلی بھی ساتھ تھے نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا جو چھپا ہوا ان کے ہاتھ میں تھا۔ آزاد رسالہ کی طرف متوجہ ہوئے تو نذیر احمد نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے، کانفرنس میں پیش کرنا ہے۔ آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کانٹ چھانٹ

شروع کردی۔ نذیر احمد، آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوش محبت سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا کہ ابھی ان کے دائرہ میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ایک "بوڑھے بچہ" کی مشق سخن پر نظر ثانی کر سکتا ہے۔

حالی بھی آزاد کی استادی کا لوہا مانتے تھے، ان کی مخلصانہ عقیدت کیشی کے لئے وہ تقریظ و تنقید دیکھئے جو "آب حیات" اور "نیرنگ خیال" پر حالی نے لکھی ہے اور جس میں ضمناً یہ طے کر دیا ہے کہ نیچرل شاعری دراصل آزاد کی صنعت فکر کا نقش اولین اور ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے۔ حالی لکھتے ہیں۔

نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے یعنی لٹریچر کے رقبہ کا طول و عرض بڑھ گیا ہے، لیکن اس کا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا۔ یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کر دی "نیرنگ خیال" کی بہت کچھ داد دی ہے کیوں کہ آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم و تشخیص کی اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور خصائل انسانی کے فطری خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں، جن سے اردو لٹریچر اب تک خالی تھا۔"

شبلی بھی آزاد کا ادب کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے، اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں، وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔" تاہم ایک ہلکی سی چشمک لیجئے!

ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگ خیال میں جہاں کی یہ تصویر کھینچی ہے۔" اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا، وہ خود نشہ میں چور تھا، ایک عورت صاحب کمال (نور جہاں) اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا اس کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اس کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر ہاتھ میں ایک فرد کاغذوں کا تھا اور

ان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سوانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لئے بدمست بھی نہیں ہوتا تھا، جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔"

"تزک جہانگیری" کے ریویو میں شبلی فرماتے ہیں: "آؤ دیکھیں اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے؟ ہمارے انشا پرداز نے جہانگیر کے کبھی کبھی ہوش میں آنے کا جو کارنامہ بتایا ہے وہ اس کی کتاب "تزک جہانگیری" ہے۔ اس کے بعد شبلی نے جو کچھ لکھا ہے، ناقدانہ اور سخن گسترانہ ہے۔ یعنی بے ضرر چشمک کی ایک خوبصورت مثال ہے جو عنوان زیر بحث کے تحت میں آسکتی ہے۔

"شعر العجم" جس زمانہ میں لکھی جا رہی تھی میں نے شبلی کو توجہ دلائی کہ آزاد کی تالیف موعود پر نگاہ رکھئے گا جو موضوع مشترک پر نکلنے والی ہے۔ وہ سمجھے میرا مطلب سخندان فارس سے ہے۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں:

آزاد کا سخندان فارس حصۂ دوم نکلا، سبحان اللہ لیکن الحمد للہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

مجھے تحریر فرماتے ہیں کہ آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں تاہم اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتی لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لکھر تک اس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا، بارھویں میں یہ میدان میں اترا ہے لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔"

میں نے لکھا "میری غرض سخندانِ فارس سے نہیں بلکہ آزاد کے تذکرۂ شعراء سے تھی۔" اس پر تحریر فرماتے ہیں "میں آزاد کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا تھا۔ لیکن آپ نے پھر ڈرا دیا۔ مجھ کو پہلے سے معلوم ہوتا تو اس مضمون پر ہاتھ نہ ڈالتا۔" یہ جزئیات جو دکھا رہا ہوں خارج از موضوع نہیں ہیں۔ ان سے یہ پتہ چلے گا کہ شطرنج کی اصطلاح میں بساط ادب کے یہ شاطر

مہرے آپس میں کس طرح گتھے ہوئے تھے۔

نذیر احمد بھی تنقیص پسند نہیں تھے۔ ان کی لے دے زیادہ تر سرسید پر رہتی تھی، لیکن اس طرح کہ

"وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"

خلوص تھا کہ حرف حرف سے ٹپکا پڑتا تھا، طبیعت میں منقولانہ رنگ غالب تھا، اس لئے شروع شروع سرسید کے اجتہادات سے ان کو جھجک سی تھی۔ جو رفتہ رفتہ گئی اور اس طرح گئی کہ سرسید کے عقیدت کیشانِ باصفا میں یہ کسی سے پیچھے نہیں تھے، اور اس پر فخر کرتے تھے۔ یہ فراخ دلی جس کے شواہد ان کے لٹریچر میں کثرت سے نظر آئیں گے، سرسید تک محدود نہ تھی۔ اوروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ ایک آدھ واقعہ استشہاداً لیجئے۔

علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں کانفرنس کی مقتدر جماعت کا اجلاس ہے اطراف ملک سے پڑھے لکھے اور رداردار لوگ آ آ کر جمع ہوئے ہیں۔ خطیبانہ بلند آہنگی کے سلسلہ میں ایک آواز یوں گویا ہوتی ہے "میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی، اب تو ایسا ذہول ہو گیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں"۔ ان فقروں کا نکلنا تھا کہ اس زمانہ کے مولوی شبلی جو نئے نئے علی گڑھ آئے تھے، ہزاروں نگاہوں کے نقطۂ شعاعی بنے ہوئے تھے۔ اور یہ ان کی قابلیت کا پہلا اعتراف تھا جس کا اثر بجلی کی طرح ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گیا۔

اسی طرح نذیر احمد لکچر سے پہلے کبھی کبھی اپنی نظم سنایا کرتے تھے ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

جس طرح یحییٰ پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی منادی کرتے تھے کہ میرے بعد مجھ سے ایک بہت بڑا پیغمبر آنے والا ہے، اسی طرح میری نظم گویا ندائے عام ہے کہ میرے بعد مولوی الطاف حسین حالی اپنی نظم پڑھیں گے، اور میں

اپنی پندار میں ان کی نظم کی رونق کا باعث ہوتا ہوں، اخلاقاً ایک ہم عصر کی شاعرانہ قومیت کے اعتراف کا یہ کتنا بلیغ اور خوبصورت پیرایہ ہے۔

اب میں نفس موضوع سے قریب ہوتا جاتا ہوں۔ یہاں تک صرف بیانات اضافی تھے۔ اصلی کام "حالی و شبلی" کو باہم ٹکرانا ہے، لیکن ترتیباً پہلے یہ دیکھئے کہ حالی نے شبلی کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں چشمک کا کوئی عنصر موجود ہے یا نہیں؟ "معارف" میں نامۂ حالی و شبلی کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری ہے، ان خطوں میں حالی، شبلی کو اس خلوص حسن اشتیاق سے یاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک تصنیف کا جس شوق و ذوق سے نام گناتے ہیں۔ وہ بھی اس آرزو کے ساتھ کہ کوئی کتاب ان کی لائبریری کے آغوش میں جگہ پانے سے رہ نہ جائے، اخلاص کی آخری حد ہے۔ خط دیر میں ملتا ہے تو کہتے ہیں "اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کیا جو پیراہن یوسفؑ نے چشم یعقوبؑ کے ساتھ کیا تھا۔" جس خط کو دیکھئے درد محبت اور ایک خاص طرح کی صدق مقالی جو بڑے بوڑھوں کا حصہ ہوتی ہے، لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ شبلی کے پاؤں کا واقعہ پیش آتا ہے تو گھبرا کر ان کے فرزند رشید "حامد شبلی" سے خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں۔ اور باوصف اس کے کہ آنکھ نے جواب دے دیا ہے، قویٰ میں بہ اقتضائے سن عام اضمحلال ہے، پھر بھی اعظم گڈھ کے سفر کی آمادگی ظاہر کرتے ہیں یہاں تک کہ "الندوہ" میں شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر حالی کو خیال آتا ہے کہ وہ مولانا (شبلی) کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کریں۔ اس لئے ایک رباعی موزوں کر کے بھیجتے ہیں کہ الندوہ کے کسی آئندہ نمبر میں اسے بھی جگہ دیدیجئے گا۔

سیرۃ النعمان جب شائع ہوئی تو حالی نے اس پر ریویو لکھا فرماتے ہیں۔

انھوں نے (یعنی شبلی نے) اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے اس کے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روش دماغی

اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے اور جہاں تک میری نگاہ پہونچتی ہے۔ "سیرۃ النعمان" کو ان سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں۔" "کتاب کی ترتیب، اصول استنباط، اور طرز اجتہاد کے لحاظ سے"، شبلی کو حالی نے فاضل، ادیب محقق اور اگر وہ منظور کریں تو منشی اور شاعر کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور دیکھا ہے کہ جس طرح حسن تناسب اعضا کا نام ہے۔ "سیرۃ النعمان" میں روایت ورایت کی تطبیق اور جس موزوں طریقہ پر رائے اور قیاس سے کام لیا گیا ہے اس طریقۂ استدلال سے فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے، اور مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے اٹھا دیئے ہیں۔

شبلی "دستۂ گل" ہدیۃً بھیجتے ہیں تو حالی جواباً لکھتے ہیں:۔

کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں، غزلیں کا ہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔"

آپ کہیں گے کہ ان مسلسل انکشافات میں سوائے بہکی ہوئی باتوں کے مقصود اصلی یعنی "چشمک" کا اب بھی پتہ نہیں۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اصلی نکتہ سے قریب تر ہوتا جاتا ہوں، اصولاً اخلاق کے ساتھ تھوڑی کج ادائی بھی ہو تو زیادہ اجاگر ہوتی ہے، جو آنکھیں روشنی کی عادی ہوتی ہیں ان کو تاریکی گراں گذرتی ہے، اسی طرح نفس انسانی کا رخ روشن اس کے دوسرے رخ کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے، اس لیے میری اضافی تصریحات بیکار نہیں ہیں۔ بہر حال اظہار خلوص کی حد تک ہو چکی، کچھ اصل موضوع یعنی "چشمک" کی مثالیں لیجئے۔

"حیات جاوید" میں ایک موقع پر حالی فرماتے ہیں، اعلیٰ تعلیم کی حمایت

کے جوش میں "سرسید" کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی غلطی تسلیم کرتے تھے۔ اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلی نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم میں اس غلطی کا جس کو سرسید ۶۔۷ برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے، ذکر کیا ہے اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبان میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے، سائنٹیفک سوسائٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے اور اپنے اس دعویٰ پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں جو خود سرسید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں، پیش کی ہیں۔"

حالی کہتے ہیں کہ اگر مولانا (یعنی شبلی) کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کی ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ انھوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے، اس لئے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل منشاء ظاہر کرنا ہے۔" حالی نے ایک ایک کر کے اعتراضات کی تردید کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ شبلی کے اعتراضات کا زیادہ تر[1] حصہ خود سرسید کے خیالات سے ماخوذ ہے، "چشمک" کی یہ پہلی مثال ہے جس میں حالی کی حیثیت نسبتی اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہے اور جس میں ناقدانہ اظہار خیال کے سوا اور پردہ کوئی چوٹ نہیں ہے۔

یہاں تک تو آپ نے دیکھا کہ حالی کا شبلی کے ساتھ کیا رنگ تھا، لیکن یہ شراب اب تیز ہوا چاہتی ہے۔ اب یہ دیکھئے شبلی کے خیالات و مقالات کا جہاں تک خوش صفات حالی کا تعلق ہے، کیا حال ہے۔ شبلی نے ابھی "المامون"

---

[1] جس مضمون کا حوالہ حالی نے دیا ہے، رسائل شبلی کے طبع جدید میں اس کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں، یعنی قدیم تعلیم اور تراجم، جدید معلومات کے اضافہ کے ساتھ وہ حصہ نکال ڈالا گیا ہے جس میں سرسید پر کچھ اعتراضات تھے۔ مہدی

نہیں لکھی ہے یا لکھی ہے، لیکن لکھنے سے پہلے حیات سعدی پیش نظر ہے ایک عزیز کو لکھتے ہیں "ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے، شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے، میں نے بے اختیار تمہارے لئے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے"، لیکن یہ دیکھنا ہے کہ شبلی صاحب خود تصنیفات کے مالک ہوئے تو حالی کے ساتھ یہ حسن ظن کہاں تک قائم رہا؟

سوانح مولانا روم میں شبلی یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔ تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ "سعدی"، "عراقی" اور "مولانا روم" ہیں اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا، تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں اور چونکہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں اس لئے مذاق حال کے موافق خواہ مخواہ بھی ان کو ترجیح دی جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے فرائض کے بالکل خلاف ہے۔"

اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی یہ مان لیا جائے کہ شبلی کا روئے سخن "حیات سعدی" یا "یادگار غالب" کی طرف ہے، تو چشمک کی یہ نہایت ہی چبھتی ہوئی مثال ہوگی جو ناظرین کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے، لیکن ایک نکتہ سنج پوچھ سکتا ہے کہ کیا یہی طریقہ نمایاں طور پر "موازنۂ انیس و دبیر" میں اور ایک کافی حد تک "شعر العجم" میں اختیار نہیں کیا گیا؟ کلیات خسرو" جس کی تہذیب و ترتیب بزعم علی گڈھ آج کل کے معرکۂ ادب میں پیش پیش ہے اور جس میں تنقید کے سلسلہ میں معاصرانہ کلام کا موازنہ کیا گیا ہے، کہاں تک واقعہ نگاری کے خلاف "مذاقِ حال" سے بے نیازی کا دعویٰ کر سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا حالی اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر تھے۔؟

"چشمک" کی دوسری مثال لیجئے۔

"تذکرۂ گلشن ہند" کے حاشیہ میں شبلی لکھتے ہیں۔ "مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اٹھایا تھا، یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے۔"

اسی طرح جیسا کہ دیباچۂ "گلزار نسیم" کے حاشیۂ ذیلی میں تصریح کی گئی ہے۔ شبلی نے لایق چکبست کو لکھا تھا کہ گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بے رحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے۔"

میں اس کے متعلق خود کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ مولوی عبدالحق کے ذمہ دار قلم سے ٹپکی ہوئی سیاہی جس طرح پھیلی ہے ایک نظر دیکھنے کے لایق ہے جس طرح ناممکن ہے کہ ٹکسالی (اسٹینڈرڈ) کتاب پر ان کا مقدمہ نہ ہو، یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی کی پاسداری میں یہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں یعنی "چشمک" کے جراثیم ان کے مقدمات میں کثرت سے ملیں گے کہ یہ امر ان لٹریچر کے خصائص کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں اور اظہار خیال سے کبھی نہیں چوکتے۔ لیکن میں اگر غلطی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں نکتہ سنجانہ لکھتے ہیں یعنی شبلی کی تنقیص مقصود بالذات نہیں ہوتی۔

یہاں تک تو "چشمک" کی صرف نرم مثالیں تھیں یعنی تلخ گولیاں غلاف شکر میں اب ذرا قوی تر شواہد لیجئے، مناقب عمر بن عبدالعزیز کے ریویو کے سلسلہ میں شبلی فرماتے ہیں:۔

"سوانح نویسی کے فرائض میں سے جو بڑا فرض مصنف سے رہ گیا وہ تنقید ہے یعنی مصنف نے اپنے ہیرو کی خوبیاں دکھائی ہیں، اس کے کسی قول و فعل پر نکتہ چینی نہیں کی، لیکن یہ اس زمانہ کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے۔"

اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"مصنفین اسلام آج کل کے فریب دہ طریقوں سے بالکل آشنا نہ تھے۔ آج کل کی سوانح نگاری کا انداز یہ ہے کہ حقیقت نگاری کے ظاہر کرنے کے لئے ہیرو پر نکتہ چینی کی جاتی ہے لیکن اس طرح کہ محاسن نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھائے جاتے ہیں۔ پھر نہایت کمزور اور ضعیف الفاظ میں ایک آدھ اعتراض بھی کر دیئے جاتے ہیں، جس سے دراصل مدّاحی کو اور قوت دینی مقصود ہوتی ہے کیوں کہ اس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعہ نگاری کے لحاظ سے کسی واقعہ کو چھپانا نہیں چاہا ہے۔ اور اس لحاظ سے ممدوح کی چھوٹی سے چھوٹی برائی کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ ورنہ ایسے محاسن اور خوبیوں کے مقابلہ میں ایک ذرا سی برائی بالکل نظر انداز کرنے کے قابل تھی۔ یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے۔ اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے۔ لیکن یہ طریقہ قدیم طریقہ سے بہت زیادہ قابل اعتراض بلکہ خطرناک ہے قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا۔ لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور خدائی ہے جو واقعہ نگاری سے بہ مراحل دور ہے۔"

یقیناً ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ شبلی کا روئے سخن کس کی طرف ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمری سے ممدوح کا مقصود کیا ہے؟ شیش محل میں بیٹھ کر اوروں پر پتھر پھینکنا ایک خوش ادائی سہی لیکن کیا دانائی بھی ہے؟ اسکا جواب صفحات زیر تحریر میں مل جائے گا، لیکن جلدی نہ کیجئے اور لیجئے!

مآثر رحیمی" کے ریویو میں ارشاد ہوتا ہے۔

اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ "خانخاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں، حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے، لیکن اس طریقہ کو ہم آج کل کے پر فریب طریقہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں، جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کر کے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے، اور کوئی عیب اور وہ بھی خفیف کر کے لکھا جاتا ہے تو اس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کے کام آئے، یعنی جب عیب نہیں چھپایا ہے تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے۔ بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے اس طریقہ کی عمدہ مثال ہے۔

ابھی اور لیجئے، موازنۂ انیس و دبیر میں اسی خیال کا اعادہ یوں کیا گیا ہے۔

ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں باوجود دعویٰ آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا اور اس کا یہ عذر کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ اس کو دکھائے جائیں لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں۔ جس چیز نے ان کو اظہار حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا، اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں، ان میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی، اس لئے وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں اور سلسلہ در سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔"

اخلاقی حیثیت سے مولانا کی نگاہ جس نکتہ پر بار بار پڑتی ہے اس کے اہم نتائج سے کون انکار کر سکتا ہے، آپ دیکھیں گے ابھی تک اظہار خیال پر ایک نقاب پڑی ہوئی ہے۔ مگر یہ نقاب اس قدر ہلکی ہے کہ باریک تاروں

سے چھن چھن کر "چشمک" کی شوخیاں آپ کے ذوق پردہ دری کو اکسائیں گی، لیکن ذرا ٹھہریئے، اس کا حسن عریانی دیکھنے کے لائق ہے، یعنی اس وقت تک تصریحات کی جگہ صرف اشارات و کنایات تھے۔ اب صاف صاف لیجئے۔ شبلی کہتے ہیں:

"حیات جاوید" میں مولانا (حالی) نے "سید صاحب" کی یک رخی تصویر دکھائی ہے، اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بدظنی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ محض دعویٰ کرتے تھے، واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے، بہرحال حیات جاوید کو مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔"

اس پر بھی تسکین نہیں ہوتی، ایک دوست کو پھر لکھتے ہیں اختلاف آراء بھی کیا چیز ہے، حیات جاوید، کو میں لائف نہیں سمجھتا بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل "خیر الناس فیما یعشقون مذاہب"۔

یہاں دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "آج کل کا پر فریب طریقۂ سوانح نگاری" جو شبلی کے خیال میں ایک طرح کی خیانت اور خداعی" ہے اور جس پر بار بار بے چینی کے ساتھ زور دیا گیا ہے، دراصل حالی کی ایجاد ہے یا شبلی کی تصنیفات بھی اسی دائرہ میں آجاتی ہیں۔ تاریخی تنقید کا یہ ایک نہایت نازک نکتہ ہے جس پر مولانا نے اگر مزید روشنی ڈالی ہوتی تو دنیائے ادب کے لئے ایک جدید انکشاف ہوتا۔

اسی طرح حالی کی یہ صنعت گری جہاں یورپ کے طرز تحریر سے ماخوذ بتائی گئی ہے، شبلی یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر فریب طریقہ سے جو ایشیائی شاعری سے ملتا جلتا ہے" موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں گی، لٹریچر کی طرف سے مولانا کی اس فی الوقت دقیقہ رسی اور جوش التفات کا شکریہ، لیکن ایک نکتہ داں یہ سوال کر سکتا ہے کہ خطرے کا احتمال

ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے لحاظ سے مغربی زبان کی کوئی سوانح عمری ایسی دکھائی جا سکتی ہے جس میں محاسن کے ساتھ معائب ابھار کر دکھائے گئے ہوں۔ کم سے کم جتنی مستند کتابیں سیرۃ (لائف) کی حیثیت سے انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں وہ اکثروں کے دائرۂ نظر میں ہوں گی لیکن افسوس یہ ہے کہ "حیات جاوید" کی طرح کسی کتاب سے مولانا کی توقعات پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتیں، یعنی ان میں ایسے مستقل ابواب نہیں ملتے جن میں "یکے از اقوام جرائم پیشہ" یا "باب الاشرار" کے عنوان سے کسی شخص کے حفظ غیب کا غیر ضروری خاکہ اڑایا گیا ہو۔

ایک ادیب معارضہ بالمثل کی حیثیت سے پوچھ سکتا ہے کہ بہ لحاظ فن حالی کے اقتصار کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے خود ان کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے یعنی المامون سیرۃ النعمان الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک ابھار کر دکھائی گئی ہیں اس کا جواب مجھے خوف ہے غیر امید افزا ہوگا۔ کیا یہ علم النفس کی حق تلفی نہیں ہے جو ایک نکتہ سنج مؤرخ" کے قلم سے ہو سکتی ہے کیوں کہ عظمت خود ملک کے سب سے بڑے مورخ" کے خیال کے مطابق واقعات کو بدل نہیں سکتی۔

بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ "حیات جاوید" کے لئے حالی کی طرف سے اعتذار (اپالوجی) کی بالکل ضرورت نہیں۔ ایک شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگذشت لکھی اور آشنائے فن ہو کر لکھی اور یہی اونچے سے اونچا معیار تحریر ہے جو ایمان بالغیب کی حیثیت سے یورپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔

یہ قطعی ہے کہ "حیات جاوید" کا رئیس التذکرہ فرشتہ نہیں تھا، انسان تھا لیکن اس کے اخلاقی اوصاف اس کی اضطراری لغزشوں پر جنھیں انسانی کمزوری سمجھئے، غالب تھے۔ یہی مابہ الامتیاز ہے جس کی بنا پر سوانح نگار کسی بڑے سے بڑے شخص کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ سر سید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی پر شبلی کو اس قدر اصرار ہے اور جن کے اظہار میں حالی نے صرف بے دردی

سے کام نہیں لیا، دراصل سرسید کی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی اخلاق کی تکمیل ناممکن ہے۔ لیکن اس قسم کی اضافی تصریحات کا بے ضرورت پھیلانا اور تنقیصی پہلو کا اس طرح نمایاں کرنا کہ اصلی محاسن دب دبا جائیں۔ بالکل ایسا ہی ہوگا جس طرح "ندوہ" کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے جس پر مولانا کا سوانح نگار کبھی راضی نہیں ہوگا اور جسے شبلی کی علمی "نفسیت" (سائیکالوجی) سے دراصل کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں ہے۔ شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے دور جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی، اور یہ امر بلا اختلاف ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے۔ ہم کو مصر کے مذہبی لٹریچر کی اوقات معلوم ہے اس لئے مصطلح جبہ و دستار کی فضیلت سے اگر قطع نظر کر لیجئے تو سرسید اور ان کے رفقا نے جو کچھ لکھ دیا ہے، مشکل سے اس پر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے، اور یہ سرسید کے اختراعی دماغ اور ان کے زبردست اجتہاد کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ عدم اعتراف دراصل لٹریچر کی خوش ظرفی ہوگی۔ میں یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا کہ عقاید کو جو جذباتی چیز ہیں معقولات سے بھڑانا جن پر ہمارے متکلمین کو اس قدر ناز ہے، دراصل کہاں تک گول خانہ میں چوکھنٹی چیز" کا مصداق ہے۔ میرا منشا صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک لکھا گیا یا آئندہ لکھا جائے گا وہ محض سرسید کے قلم کی آواز بازگشت ہوگی۔ یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ حالی کے ہیرو کے ساتھ شبلی کو اس قدر "رشک" کیوں ہے۔ کیا یہ جامع حیثیات شخصیت شبلی کے ناموران اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ یا جس طرح ایک خوبصورت عورت دوسری پر کالہ آتش کو دیکھ نہیں سکتی! دراصل جذبۂ رشک اس کی تہ میں ہے، ملک کے ایک بہت

بڑے فاضل کی رائے کے مطابق سرسید کے بعد اگر اردو میں کوئی قلم اٹھا سکتا ہے، تو وہ حالی ہیں، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حالی نے "سرسید کی صرف کثیر الاوراق لائف نہیں لکھ دی"۔ بلکہ یہ اردو لٹریچر میں ایسا اضافہ ہے جو حالی کی ذات پر ختم ہو گیا لیکن کیا شعر العجم کے مصنف کو بھی اس پر رشک کرنا چاہیئے۔ اس کا جواب آگے چل کر تاریخ دے گی۔ نہ جاننا کبھی کبھی جاننے سے زیادہ باکیف ہوتا ہے۔ اس لئے سردست میں اس لطف کو کھونا نہیں چاہتا۔

لیکن شعر العجم کے ساتھ جو ایک ذوقی چیز ہے، میری بڑھی ہوئی حسن عقیدت اس موازنہ کو جائز نہیں رکھے گی، اس لئے حیات جاوید کے مقابلہ میں شبلی کی صرف ان تصنیفات کو رکھئے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے جنس مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آج کل کی عوائد رسمیہ (ایٹی کیٹ) کی نزاکتیں شائستہ سوسائٹی میں موازنۂ اوصاف کو جائز نہیں رکھتیں لیکن مصنفین کے دماغوں کی رگڑ فن تنقید کا ایک سخن گسترانہ فرض ہے جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے چشمک کے وہ عقدہ ہائے سربستہ جن میں حالی کے مقابلہ میں لائق عزت شبلی کا پہلو کچھ دبتا ہوا[1] سا ہے، کھلے ہوئے راز کی حیثیت سے پیش کئے گئے ہیں۔

---

[1] میرے مخاطب صحیح وہ حضرات نہیں ہیں جو تنقیص و تنقید میں امتیاز نہیں کر سکتے، یا کرنا نہیں چاہتے۔ نہ جاننا (جہل)، چنداں لائق اعتراض نہیں، لیکن یہ بھی نہ جاننا کہ نہیں جانتے (جہل مرکب)، قطعاً لائق معافی نہیں۔ ایک بیباک نے حال میں لکھا تھا کہ شعر العجم پروفیسر براؤن کی "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" کا سرقہ ہے، شاید کہنا یہ منظور ہو گا کہ براؤن کی کتاب سے ماخوذ ہے، لیکن غریب کو معلوم نہیں کہ براؤن نے فارسی شاعری کی تاریخ نہیں لکھی بلکہ دراصل وہ اسلامی لٹریچر کی دماغی تاریخ ہے، ایران سے جو کچھ تعلق ہے یہ ہے کہ براؤن ان مصنفین کو الگ کرتا گیا ہے جو اسلام کے وسیع دور میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ) خاک عجم سے وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے، اس میں شعراء کا ذکر ضمناً آیا ہے، وہ بھی تاریخی حیثیت سے ذوقی اور جذباتی حیثیت سے نہیں کہ براؤن کے بس کی بات نہیں تھی، شعر العجم کا موضوع بالکل جداگانہ ہے۔

ہماری زبان پر "فلسفہ"، "ارتقا" اور جانے کیا کیا بے سوچے سمجھے اس بری طرح چڑھ گیا ہے کہ خیر سے معلومات میں تو کچھ اضافہ ہوا نہیں لیکن ان الفاظ کی رہی سہی آبرو بھی جاتی رہی۔ جس ملک میں تنقید عالیہ (ہائیر کریٹی سزم) کا مفہوم صحیح اچھے خاصے پڑھے لکھے نہ سمجھ سکتے ہوں، میں نہیں جانتا شعر العجم کی نزاکتیں کس طرح ان کے ذہن میں داخل کی جائیں۔ مجبوراً میں اس گناہ کا مرتکب ہوتا ہوں جس سے اوروں کو باز رکھنا مقصود ہے اور مجھ کو کہنا پڑتا ہے کہ شعر العجم تذکرۂ شعراء نہیں بلکہ جہاں تک شاعری کی ماہیت نفسی کا تعلق ہے، اس کی ارتقائی تاریخ ہے (دیکھئے "ارتقا" زبان پر آ ہی گیا)

جس طرح ماضی حال کا باوا اور مستقبل کا دادا ہے، بعینہٖ دنیائے ادب میں بھی یہی ترتیب عمل جاری ہے، متقدمین نے متوسطین اور متوسطین نے متاخرین پیدا کئے، بالفاظ غیر، سعدی، حافظ، فردوسی اور خیام جس زمانہ میں ہوئے اور جو کچھ ہوئے اسی زمانہ میں ان کا ہونا ناگزیر سا تھا، اسی طرح ان کے کلام کی عصری خصوصیات دراصل ان کے کمال اجتہاد سے زیادہ وراثت ادبی کے قدرتی نتائج ہیں۔ شعر العجم نے اسی طلسم کی عقدہ کشائی کی ہے لیکن یہ باتیں ابھی نصف صدی کے بعد ہماری سمجھ میں آئیں گی اس وقت تک اس کتاب پر اظہار خیال ملتوی رہتا تو اچھا تھا۔

شبلی تو کیا براؤن کا خاکہ اڑائیں گے، لیکن ایک صاحب نے علی گڈھ میں بیٹھ کر ڈلکے کی چوٹ شاعری پر جس جامعیت کے ساتھ اظہار خیال کی ٹھہرائی ایڈیٹر معارف کے سنجیدہ قلم کو اعتراف کرنا پڑا کہ گویا "شعر العجم" ہے۔ ایک چھوٹے سے لفظ کے زہر کو دیکھئے گا جس کا تریاق ایک دفتر میں بھی نہیں ہو سکتا۔

مہدی۔

قبل اس کے کہ میں اسے ختم کروں ایک فقرۂ معترضہ بالطبیعت ہو رہا ہے، جس سے اسی سلسلہ میں نپٹ لینا چاہتا ہوں۔ "چشمک" جس کے متعدد نظائر جہاں تک گنجائش تھی بہم پہونچائے گئے ہیں۔ وراثت طبعی کے اثر سے اس کا سلسلہ اور بڑھتا ہے۔ ایک زاویۂ علمی کا نوجوان "سید الطائفہ"[1] جسے آگے چل کر نظام ادبی کا ایک قوی تر عنصر ہونا ہے، ایک غیر متعلق تصنیف کے سلسلہ میں یوں اظہار خیال کرتا ہے۔

"مولوی نذیر احمد بھی اس گناہ کے مجرم ہیں، جس قلم نے مراۃ العروس بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت اور ایامیٰ لکھنے میں زندگی بسر کی ہو۔ وہ الفرائض اجتہاد، ترجمۂ قرآن، امہات الامۃ کے لئے سنجیدگی عبارت، متانت کلام اور ثقاہت بیان کہاں سے لائے گا۔ مقصود یہ ہے کہ مذہبی کتابوں اور بزرگان دین کی تاریخ کے لئے سنجیدگی چاہیئے۔ شوخ اور ظریفانہ عبارت اور سخیف محاورات موزوں نہیں۔"

یہ مولوی نذیر احمد کون؟ وہی جن کا تصنیفی نام عوام میں ڈپٹی نذیر احمد ہے! آبا، آقائے اردو علامہ نذیر احمد ایل ایل ڈی، جو ملک میں السنۂ مشرقیہ کا سب سے بڑا ادیب تھا جس کی عربیت اس پایہ کی تھی کہ سخت سے سخت منحرف بھی اس کا لوہا مانتے تھے، اور اس کے تبحر علمی سے مرعوب رہتے تھے جس نے اردو سی کم مایہ زبان کو اپنے خاص طرز ادا اور زور فصاحت سے ایسا کر دیا کہ آئندہ دنیا اس پر ادب العالیہ (کلاسیکس) کا اطلاق کرے گی۔ جس کی طبیعت میں قدرت نے عربی کا مذاق اس لئے رکھا تھا کہ وہ عرب کے صحیفۂ آسمانی کا قالب بدل سکے۔ پہلے ترجمۂ قرآن کا یہ رنگ تھا۔

"مستی نکالیتاں اور یار کرتیاں چھپ کر"

---

[1] یعنی مولانا سید سلیمان ندوی۔ مرتب

اب وہ شستہ رفتہ اور فصیح اردو کا ایسا مرقع ہے جس پر انشا پردازی ناز کر سکتی ہے۔ نذیر احمد نے مراۃ العروس کے سوا اگر کچھ نہ لکھا ہوتا جب بھی ان کے کمال انشا پردازی کے ثبوت کے لئے یہ اکیلی کتاب کافی تھی ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اس وقت ایک گراں پایہ مصنف تھے۔ جب ہمارے لائق ادب بزرگوں میں بہتیروں نے قلم ہاتھ میں نہیں لئے تھے۔ رہی ان کی ظرافت جو ان ہی کا حصہ ہے اور جسے آپ کھانے میں نمک سمجھئے اور میں لٹریچر کے چہرے کا تبسم کہوں گا، جو نئی تحقیقات کے مطابق صرف خوش ادائی نہیں، بلکہ اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ کامل صحت کی دلیل ہے۔

صرف ایک مثال لیجئے! نزول قرآن کے سلسلہ میں "نذیر احمد" اپنے فصیح لکچر میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے وہ ایک وقت تھا کہ عربی لٹریچر کے جوبن پر ایک بہار آرہی تھی۔ لوگوں میں یہ مادہ ایسا برسر ترقی تھا کہ کوئی متنفس مذاق شعری سے خالی نہ تھا۔ یہ تو عربی زبان کے عروج کا زمانہ تھا۔ یوں بھی عرب کو اپنی بولی پر بلا کا ناز تھا۔ انھوں نے اپنے سوا دوسروں کا نام رکھا تھا "عجم" یعنی گونگے یا جن کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ ایسے لوگوں سے کیسی ہی اچھی بات کہی جاتی مگر وہ ہوتی حلیۂ فصاحت سے عاری، تو ان کے کان پر جوں بھی نہ چلتی۔ پس ضرور تھا کہ اسی داؤ سے ان کو پچھاڑا جائے جو ان کو خوب رواں تھا، یعنی "فصاحت"، قرآن نازل ہوا تو جو اپنے اپنے وقت کے "سرسید"، "محسن الملک"، "سید محمود" اور "حالی" و "شبلی" تھے، سب کے چھکے چھوٹ گئے۔"

یہی بلاغت ہے جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ انشا پرداز کا ایک فقرہ ہزاروں علمی اور تاریخی اوراق پر بھاری ہوتا ہے اور یہی تصرفات ہیں

جن کے لحاظ سے ایک ادیب کو بڑے سے بڑے فلسفی اور مورخ پر ہمیشہ ترجیح رہے گی۔

یہی بلاغت تھی جس نے کسی زمانہ میں "حیدرآباد دکن" کے "بسمارک" کو نذیر احمد کا شیدائی بنا رکھا تھا۔ "سر سالار جنگ اول اسٹیٹ ڈنر پر ہیں، طلائی قابوں کا دور چل رہا ہے، چھری کانٹوں کی دھیمی موسیقیت میں دفعتاً سرکاری ڈاک کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو فوراً پیش کی جائے ایک منٹ کے بعد جلیل القدر میزبان شام کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے۔ برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائق ادب امیر الامراء کی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑ رہی ہے اور چہرے پر رہ رہ کر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جیسے تبسم زیر لب کی ہلکی لہریں کہئے، نذیر احمد کے خوان ادب کا یہ وہ لقمۂ تر تھا جس سے شاہی میز بھی بے نیاز نہ رہ سکی لیکن اب یہ ہمارے گلے میں پھنسنے لگا ہے، جسے ہم اگلنا چاہتے ہیں، مگر یہ بے نمکی، روایات سابقہ کے لحاظ سے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ ادب چاہتا ہے ان کا کمال انشا پردازی غیر مستانہ جنبش لب سے ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

آخر میں مجھے ایک نکتہ صاف کرنا ہے یعنی حالی کے ساتھ شبلی کی چشمک کے جو شواہد پیش کئے گئے ہیں۔ ان سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ شبلی کو حالی سے خلوص نہیں تھا۔ شبلی، حالی کو ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ جب تک مواد تحریری نہ ہو میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں، ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے۔"

پانوں کے واقعہ کے بعد شبلی کو حالی نے دفور جوش میں جو رباعی

لکھ کر بھیجی تھی اور جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، شبلی "الندوہ" میں مولانا حالی کی ذرہ نوازی" کے عنوان سے یوں رقم طراز ہیں۔

"مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرہ نوازی ہے۔ وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں، لیکن میری یہ عزت ہے کہ مجھ کو اپنے نیازمندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔ اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر قدما کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، خدا ان بزرگوں کا سایہ قائم رکھے۔"

بہر حال "چشمک" جو کچھ تھی ادبی حیثیت سے تھی، سنجیدہ تعلقات دونوں صاحبوں کے اتنے ہی خوشگوار تھے جتنے باوصف اختلاف و بلائے مقدمہ کے اجلاس سے باہر ہوا کرتے ہیں۔ ان چند صفحوں سے خصائص نفسی کے مختلف رخ سامنے آگئے ہیں ورنہ میری غایت محض تنشیط ادب یعنی احباب کی دماغی تفریح کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حیثیت سے اردو لٹریچر میں غالباً یہ ایک نیا مضمون ہے۔[1]

---

[1] اس مضمون میں جس قدر اقتباسات لئے گئے ہیں ان کے لئے اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ (سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی) کا پورا دفتر پیش نظر تھا لیکن افسوس ہے کہ سلسلۂ اقتباس میں میں نے صفحات متعلق کے حوالے محفوظ نہیں رکھے، ختم کرنے کے بعد اس کا خیال آیا، اب یہ ایک دردسری تھی جسے کسی طرح گوارا نہیں کر سکا تاہم میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس پیوند کاری میں میں نے کہیں سے کوئی تصرف یا اضافہ نہیں کیا ہے اور جس قدر اجزا جہاں جہاں سے لئے گئے ہیں علامات اقتباس میں بجنسہٖ پیش کر دیئے گئے ہیں جن میں کوئی گھٹ بڑھ نہیں ہونے پائی ہے۔